باب ۴

فرد اور جمعیت

جمعیت بندی، اسلام کا اصولی نظریہ

فرد اور جمعیت ایک پرانا مسئلہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (سورۃ النساء)

''اے لوگو اپنے رب سے تقویٰ اختیار کرو کہ جس نے تمہاری تخلیق نفس واحدہ سے کی ہے''

بنیادِ وجود ایک ہے۔ بچہ پر توحید پر پیدا ہوا۔ اس کا ہر عمل کُلّی اکائی کے انداز میں ہوتا ہے۔ انسان کی منتہائے مقصود بھی ایک رکھدی ہے۔ یہ سمجھنے کی بات ہے۔

فرد اور جمعیت ، وحدت الوجود ،نفسِ واحدہ بڑے پرانے مسئلے ہیں جن پر مفکرین، معلمین، حکما، فلسفیوں اور اہلِ مذہب نے غور کیا ہے۔ پتا کی بات یہ ہے کہ سوائے اسلام کے دوسرے مذہب والے اور کچھ اپنے علماء بھی اس چکر میں لگ گئے کہ میرا عجز و نیاز، میرا زہد و تقویٰ ، میری دعا، میرا عشق، میرے دیدار کی انتہا وغیرہ۔مگر یہ تخیل سراسر اسلام یعنی جمعیت بندی کے خلاف ہے۔ اسلام میں تو مشترکہ کوشش کو اہمیت دی گئی ہے۔ سارے عالمِ اسلامی کو ایک جسم واحد کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ اسلام ہی تمام مذاہب کا نچوڑ ہے اور انسان کی تمام اقدار کو ایک توازن میں لانے کا سبق دیتا ہے۔فرد کی سطح تک ہی نہیں، بلکہ جمعیت کے انداز میں بھی میزان قائم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور اس میزان کو نعمت بھی بتایا ہے جو انسان کو عطا ہوئی ہے۔ دوسرے حیوانوں

کونہیں۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ o اَلَّا تَطْغَوْ فِی الْمِيْزَانِ o وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُو الْمِيْزَانَ ..... فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ .

''اور آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کی۔ میزان میں زیادتی نہ کرو۔ توازن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کمی نہ کرو..... اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''

علمائے ظواہر کہتے ہیں کہ فرد ٹھیک ہو جائے تو امت ٹھیک ہو جائے۔ یہ غلط تخیل ہے۔ اول تو فرد کی اہمیت ہے ہی کیا، کیا دنیا، کیا عقبیٰ ۔ ہماری عبادت اور دعا تک جمع کے صیغہ میں ہیں۔ میزان اکیلا انسان کیا قائم کر سکتا ہے اور یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ٹھیک ہو کر بھی افراد میں اور انفرادیت کوٹ کوٹ کر زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عبادت گذار لوگ اور فقراء تک رقابت، حسد، مَیں بڑا تو چھوٹا کی نفسانفسی میں پڑ جاتے ہیں۔ آخر یہ کہاں کا اسلام ہے۔ اچھے اچھوں کو اس حالت میں دیکھ کر رونا آتا ہے۔

اسلامی جمعیت کو تو اُمت وسطیٰ و افراد و تفریط سے بچنے والی، کے لقب سے نوازا ہے۔ تا کہ عالمِ انسانی کے لئے یہ جماعت ایک متوازن نمونہ بن کر پیش ہو۔

" اُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ "

اور وہ اس لئے کہ تمام عالمِ انسانی ہی کیا تمام عالمِ خلق ایک نفسِ واحدہ سے تخلیق ہوا ہے۔ ایک وحدت الوجود میں ہے۔

وحدت الوجود

لوگ وحدت الوجود پر عقلی گدّے لگاتے ہیں۔ وحدت الوجود کوئی عقیدے، یا علم الیقین کی بات نہیں ہے بلکہ حق الیقین کی بات ہے واردات ہے۔ خود آگاہی کا دروازہ کھل جائے تب کہیں عَرَفَ رَبَّہٗ ہوتا ہے۔ توحید کا قطرہ ملتا ہے۔ اس اکائی میں جب اپنے نفس کا عرفان پایا توحید کا قطرہ ملا تو خود بحرِ حقیقت ہو جانے کی مستی میں آتا ہے۔ یہ 'ہے' کی لذت ہے۔ 'ہے' کی مستی ہے۔ خود آگہی کی واردات ہے۔ یہی حقیقت کی جان ہے۔ اس حالت میں جانِ من جانِ عالم ہوتی ہے۔ اس تخلیق کی اکائی کا جب حق الیقین ہوتا ہے تو جس کو میں 'میں' کہتا ہوں وہ حقیقتِ کُل کی ہی آئینہ داری کرتی ہے۔ یہ حق الیقین اسی وقت ہوتا ہے جب شدّت جذب میں اپنے سے گم ہو، لامحدود سے ہم آہنگ ہو یقین جب وحدت الوجود میں ہو۔ اس حالت میں عاشق خود معشوق ہوتا ہے۔ سب عالم اس کے حُسن کی آئینہ داری میں ایک ہوتا ہے۔ بغیر عشق کے یہ وحدت الوجود کا نشہ نہیں چڑھتا۔ اس حالت کے کیف میں کسی کو بھوکا دیکھا تو آپ کے پیٹ میں بھی وہی بھوک کی آگ لگی۔ اس بھوکے سے ایکائی قائم ہوتے ہوئے اس نفسِ واحدہ کے مقام میں لگن ضروری ہے۔ یا کسی جانور کے کوڑے پڑ رہے ہوں تو اس شدت ایکائی میں آپ کے بھی وہی کوڑے کے نشان پڑ جاتے ہیں یا کوئی درخت سوکھ رہا ہو تو آپ کو بھی پیاس کی تپش ستاتی ہے۔ یا آپ کسی کے پیر داب رہے ہوں تو جیسے ساتھ ہی آپ کے بھی پیر دابے جا رہے ہوں۔ کلہاڑی سے لکڑی چیرنے میں کسی کے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں تو آپ کے ہاتھوں میں بھی چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یا چاقو

سے آپ اپنی انگلی کاٹ لیتے ہیں تو سامنے والوں کی انگلیاں بھی کٹ جاتی ہیں۔ یہ عقل میں آنے والی بات کب ہے۔ یہ کیفیت تو خیر بڑی چیز ہے اس کی جھلک تک کو کون پہنچا۔ کسی کو اگر توحید کا ایک ذرّہ بھی مل جائے تو کائنات میں ایک عجب ہم آہنگی اسے نظر آنے لگے۔ توحید تو اسی وقت ہے جب جیتے جی انفرادی وجود کے حبس سے نکلے۔ روح جو جسم کے حبس کے اندر گھٹتی ہے انسان جو استغفار وجود کرتا ہے، اس کیفیت کو کتنوں نے لیا ہوگا۔ یہ بات وجود سے ماورا ہو کر ہی جان سکتے ہیں کہ توحید خالق و خلقت سے ایکائی میں آ جانا کیا چیز ہے۔ وحدت میں ایسی ایکائی کہ اللہ ایک ہے کہنا بھی دوئی ہے۔ شرک ہے۔ ''قُلْ ھُوَ اللہ'' عاشق و محبوب میں ایسی ایکائی ہے کہ ''قل'' میری جانب سے آپ کہہ دیں۔ وحدت میں ایک ہی ایک رہ جاتا ہے۔ ''ھُوَ اللہُ اَحَد'' اللہ ہی اللہ کہہ لو یا مَیں ہی مَیں ۔ وحدت یا یوں سمجھیں کہ وحدت اگر مصوّر خود ہے تو توحید تصویر ہے۔ حقیقتِ وحدت ایکائی ہے۔

مگر حقیقت کیا ہے۔ پس پردہ کیا ہے۔ جو کچھ ہم سمجھتے یا دیکھتے ہیں، اس سے کیوں تشفی نہیں ہوتی ۔ اور جتنے حجابات اٹھاتے جائیں اور بے چینی بڑھتی ہے۔ جتنا جتنا انسان اپنی فنا حاصل کر جائے، لاکی منازل طے کرتا جائے، اس حد تک انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ انسان شعور کی منازل میں درجہ بدرجہ فنا حاصل کر لے تو لاشعور کے حجابات ہیں۔ ان پردوں کو ہٹانا، ان چھلکوں کو اپنے وجود سے دور کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ پھر اس کے بعد جبلتیں ہیں، لاکھوں سال پرانی۔ ان سے چھٹکارا ہونے کے بعد ہی کہیں روح کے مقام پر بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ شعور، لاشعور، اور جبلتوں کے پردے یا حجابات یا رکاوٹیں دور کرنا سوائے عشق کے جذبے کے ممکن نہیں۔ عشق ہی وہ شدت

اپنے میں لاتا ہے جس سے باطن اجاگر ہوتا ہے۔ عشق ہی یہ آہنی دیواریں پار کراتا ہے۔

ابتداء یہی ہے کہ اپنی شعوری، 'مَیں' پر سے ما سوا کے چھلکے اتارتے جاؤ۔ بقولِ غوث پاکؒ پہلے خلق سے مرجاؤ، پھر نفس سے، پھر ارادے سے۔ اس کے بعد لاشعور اور جبلّتوں کے پردے کسی پشت پناہی میں بہ طفیلِ عشق پار کرنے ہیں۔ پھر کہیں مقامِ روح تک پہنچنا ہے۔ یہ کسی کسی کے نصیب میں ہی ہوتا ہے۔ یہاں بس اٹھا لئے جانے کی بات ہے۔ بغیر دستِ کرم کے یہاں بات نہیں بنتی۔ اپنی کوششوں اور مجاہدوں، ریاضتوں سے یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ جب بہ فیضانِ نظر روح کے مقام پر بصیرت حاصل ہوتی ہے تب کہیں زمان سے آزادی ملتی ہے۔ پھر جب تک زمان مکان سے رہائی حاصل نہ کرلے حقیقتوں تک رسائی کیسے ہو۔ زمان سے آزادی ملنے کے بعد ابو الوقت ہونے کے بعد ہی کہیں واقعات کا رخ یا اسی قسم کی چیزیں صحیح طور پر آشکار ہوتی ہیں۔ پھر روح کی منازل پر بھی انفرادی روح ہے۔ اس کا ارتفاع ہوتے ہوتے روحِ کُل کی بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ جو ستر ہزار پردوں میں ہے اس تک رسائی کیسے ہو۔ اپنے خیالات یا ذہن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اس کا علم ہو جاتا ہے مگر تجربہ نہیں ہوتا۔ اور اک اسی کو ہوتا ہے جس کے نصیب میں ادھر سے گذر ہو۔ بہت سوں کو بصیرتِ روح بھی حاصل ہو جائے تو دیکھ تو لیتے ہیں مگر جاننا تو ہو جانا ہے۔ ہونے میں ہی اصل حقیقت کی واردات ہے۔ 'ہے' کی واردات ہے۔ اور 'ہے' کا جو انتہائی شعور ہوسکتا ہے وہ ہے نورِ محمدیؐ۔ اسی لئے سوائے اس کے کیا بیان کیا جائے کہ 'ہے' کی واردات حق کا جلوہ ہے۔ گویا انجامِ کار جس نے اپنے نفس کا عرفان کیا اس نے رب کا عرفان کیا۔ ''مَنْ

عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' اس طرح اپنے ہی آئینہ میں اس کی دید ہے اور جب اپنی حقیقت اپنے پر آشکار ہوئی تو انا الحق کہہ اٹھتا ہے۔ یہ بھی پردہ ہے ''مَیں'' ہے کہاں جب حق ہی حق ہے گویا یہ بھی انائے جزوی کی کیفیت ہے۔ انفرادی سی بات ہے۔ البتہ اس ''مَیں'' کے آئینہ میں اَنا کے آئینہ میں کسی مظہرِ حق کی جلوہ گری پائیں۔ 'مَیں' فانی تُو باقی، تو انائے جزوی پھیل کر انائے محبوب انائے مطلق ہو جاتی ہے۔ اس وقت اپنی روح میں بھی انائے مطلق کی تابانی آنے لگتی ہے۔ روحِ اعظم تک رسائی ہوتی ہے۔ اب کہیں کُل تخلیق، انائے مطلق کی شان نظر آتی ہے۔ اب کہیں ساری تخلیق ایک نفسِ واحدہ کا ظہور نظر آتی ہے۔

اے جلوہ گہِ رُوئت ، ہر وجہ و ہر رُوئے
راہے تو وکوئے تو ، ہر راہی دہررا ہے

''کہ تیرے جلوہ کی جگہ ہر چہرہ ہر روپ۔ تیری راہ اور تیرا کوچہ ہر راستہ اور ہر راستہ چلنے والا بنا ہوا ہے''

غیب

غیب اسی انا ، اسی 'مَیں' کے سوا، جو انائے مطلق ہو چکی ہو کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ مٹی کے جسم والی 'مَیں' یہ خیال والی 'مَیں' یہ عشق و محبت والی 'مَیں' مٹتی نہیں۔ کسی میں گم ہوتی جاتی ہے۔ اسلام باطن میں بھی میزان کا سبق دیتا ہے تب ہی انائے جزوی یا انائے مطلق کے مقام پر توازن میں رہنا، میزان قائم رکھنا کرم کے وسیلہ ہی کی بات ہے۔ رحمت کے وسیلے سے ہی ان تمام اعلیٰ مقاماتِ غیب پر توازن قائم رہ سکتا ہے۔ انسان اپنا جائزہ لے تو مقامِ

ناسوت سے مقامِ ملکوت پر اٹھانے کے لئے اپنی محنتیں ، ریاضتیں پرہیز گاری ضرور کام دیتی ہے۔مگر مقامِ ملکوت سے اوپر رسائی کے لئے بغیر دستِ کرم بغیر عشق کے کام نہیں بنتا۔عشق ہی کے طفیل رحمتوں کی نسبت ملتی ہے۔یعنی جس ذرّہ کا رُخ سورج کی طرف ہو وہی چمکتا ہے۔اس طرح غیب میں انوارِ محمدیؐ میں قدم رکھنے کے لئے پہلے محبت ہے، پھر ایمان، پھر احسان ہے۔احسان یہی ہے کہ پیر کے صدقے برزخِ شیخ سے برزخِ رسولؐ تک رسائی ہوتی ہے۔مقامِ جبروت میں اٹھا لئے گئے تب کہیں نبی کریمؐ کی خوشبو ملتی ہے۔رحمت وسیع ہے۔ رَحْمَتِیْ وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ۔ یہ رحمت کا پہلو ہی توحید ہے۔توحید کی منازل میں، رحمتوں کے دامنوں میں، میزان اور توازن کے طریقہ سے ترقی کریں تو 'مَیں' کی حقیقت اس غیب کے انکشاف کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ میں بندہ ہوں۔سر کسی کے قدموں میں ہی رہتا ہے۔انانیت کا غرور برباد نہیں کرتا۔یہ عجز کا مقام ہے۔بندگی کا مقام ہے۔اس طرح انائے مطلق کی کیفیت میں بھی عبدیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

لوگ عبدیت کو، عجز کو، آسان سمجھتے ہیں ۔مگر یہ عبدیت، یہ عاجزی تو سب سے اعلیٰ مقام ہے۔عبدہٗ کی شان ہے۔یوں ہم زمین پر رہ کر کیا عاجزی کی بات کرتے ہیں ۔ جب بلندیوں میں عروج ہو، روحِ اعظم ، انائے مطلق کی بات ہو تو اس ہستی وحدت میں بھی آسمان کی طرح جھک کر رہو تو بات ہے۔ بھوکا عاجزی کی کیا بات کرے۔محبوبیت کا تاج پہن کر عاجزی کی بات کرے تب بات ہے۔نازشِ حُسن بن کر جب نیازمندی آئے تب کہیں شانِ قہاریت حُسن ہے۔ یہ دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔محبوب ہو کر ہی عبدہٗ بنتا ہے۔اگرچہ اس مقام پر کوئی دوئی نہیں رہتی۔حسنِ ذات سوائے نورِ ذات کے جو اپنے ہی اندر

ہے کچھ نہیں ہوتا۔

اس مقامِ توحید کا کوئی شناسا ہو جائے تو ایسا یُون (ہم آہنگ) ہو جاتا ہے کہ دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ میری رضا تیری رضا کا فرق اٹھ جاتا ہے۔ پھر بھی کرم شاملِ حال ہوتا ہے۔ فضلِ الٰہی کو اب بھی ڈھونڈتا ہے۔ یہ آسان بات نہیں سراب بھی قدموں میں ہی رہتا ہے۔ اسی لئے یہ عبودیت ادھر سے نیاز ہوتی ہے تو ادھر سے ناز۔ یہ ہے صحیح مُوَحِّد کا مقام۔ یہ صرف زبان سے اللہ ایک کہنے والی بات نہیں بلکہ خود عینیتِ توحید ہو جانا ہے۔

میزانِ توحید

اسلام ہی جسم، قلب، روح کی منازل میں میزانِ توحید قائم کراتا ہے۔ کیا نچلی جسمانی زندگی کی منازل، کیا روح، عالمِ امر کی منازل اور اعلیٰ مقامات کو یا سب جگہ ہی دست گیری کرتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

''جس نے اپنی میزان ٹھیک رکھی وہی فلاح والوں میں ہے'' اعراف: ۸

زندگی کے کاروبار اور تجارت میں بھی میزانِ خدمتِ خلق اور نماز و دیگر ارکین میں بھی میزان، عشق اور اعلیٰ مقامات پر رسائی کے بعد بھی میزان۔ یہ میزان قائم کئے بغیر نہ جمعیت سے توحید حاصل ہوتی ہے نہ اپنی انفرادیت سے۔ اسلام نے عملی زندگی میں توحید کو بنیادِ دین قرار دیا ہے۔ بنیادِ جمعیت بندی اور شانِ اُمّتِ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ یہ توحید، یہ ایکائی محبت والوں کے درمیان ایک فطری سادگی کی سی بات ہے۔ خود بخود سی بات ہے۔ جیسے کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے لئے ثبوت نہیں چاہیے۔ جسم، جان، قلب، روح

سب ہی ایک رخ ایک توحید میں ہوتے ہیں۔ اپنے اندر جب یہ ایکائی آجائے تو نیک اعمال بغیر فکرِ سزا و جزا، بغیر ثواب کمانے کی فکر کے، ایسی بے ساختگی میں، خود بخود پھوٹ رہے ہوتے ہیں کہ عقل کی تدبیروں کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ ایسی سادگی کی حالت میں اندر باہر ایک ایکائی میں عام زندگی گذارنا اس سطح کی توحید ہے۔

پھر قلب کی سطح پر ایکائی ہے محبوب کے ساتھ۔ اور روح امرِ ربی تو ہے ہی سراپا حکم سراپا، توحید کی بات۔ روح کے تصرف میں ہی جسم، جان، خیال، قوت، جذبات، عشق وغیرہ ہیں۔ لوحِ محفوظ کی تحریر بھی تو یہی کچھ ہے جس کے تحت امرِ الٰہی، روح و قلب و جان اور انسان کی فطرت میں، ایک توحیدی انداز میں، ودیعت ہوا ہے۔ اسی طرح اسلام کی اصل منزل، مقامِ روح سے ہی شروع ہوتی ہے۔ یہاں امرِ ربی کی کارفرمائی ہے۔ رحمتوں کا سایہ ہے۔

اسلام دینِ فطرت، اس توحید کی عمل پیرائی ایک ہم آہنگی کے ساتھ زندگی کے ہر قول و عمل میں چاہتا ہے اور ساتھ ہی فرد اور جمعیت میں ایسی وحدتِ ملّی ہے کہ سب ایک وجود ''اَلْمُؤْمِنُ کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ.....'' مومن ایک جسم واحد کی طرح ہیں کہ آنکھ کو تکلیف ہو یا ہاتھ کو تکلیف ہو تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے۔ ''کَجِسْمٍ وَّاحِدٍ کَالْمُشَط'' کنگھی کے دانتوں کی طرح ہیں۔ اس وحدت کے ساز کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ستار میں کئی تار ہم آہنگ ہو جائیں۔ تار تو ایک ہی چھیڑا جاتا ہے۔ مگر دوسرے خود بخود ہم آہنگی میں بجتے ہیں۔ اس وقت یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ چھیڑ کہاں سے ہوئی۔ اسلامی توحید یہ ہے کہ سب ساتھ چلو، ریلے پیلے میں سب ہی نکل جاتے ہیں۔ خواہ جنتی دروازہ ہو یا طوافِ کعبہ، یا بہشت میں داخلہ۔ توحید جزوی نہیں ہوسکتی۔ ایک

فرد کا عمل توحید نہیں کہلا سکتا۔ توحید کُلّی ہے، جمعی ہے۔ اسلامی توحید جماعت کا نام ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے نسل، رنگ، زبان تک کی توحید ایمان اور محبت میں کرادی۔ ایک طرف معاشرتی توحید قائم کرادی تو دوسری طرف قلوب میں توحید قائم کرادی۔ قرآن بھی قلوب پر نازل کیا گیا اور قلوب نے ہی اس کی تصدیق کی۔ یہ قلوب کی توحید دوسری قوموں کو آج تک نصیب نہ ہوسکی۔ قلوب میں بہ طفیلِ نسبتِ محمدیؐ وہ ایمان کی جلا آئی کہ نبی کریمؐ پر فدا ہو گئے۔ وضو کا پانی تک زمین پر نہ گرنے دیا۔

مسلمانوں میں ایمان ہو، عشقِ رسولؐ ہو تو ان کی اُمت سے محبت ہو جانی لازمی ہے، وگرنہ اگر اپنوں اور دوسروں کی تمیز ہے، بُروں سے نفرت ہے تو کیسا ایمان۔ ارشادِ گرامیؐ تو یہ ہے ''نیک اللہ کے، گناہگار میرے''۔ جب رسول اللہؐ ہمارے درمیان میں ہوں تو کیسی افراتفری۔ فاسق، فاجر تک کی خطائیں بری نہ معلوم ہونا چاہئیں۔ جیسا کہ اپنے عزیزوں، اولادوں سے ہم کرتے ہیں۔ اچھے بُرے سب عزیز ہوتے ہیں۔ جب ہم سب ایک جسمِ واحد کی کیفیت ہیں تو یہ بھی تو دیکھیں کہ انسانی جسم میں عضو عضو کہاں علیحدگی چاہتا ہے یا علیحدہ کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ مسلمان تو سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اچھے بُرے سب ایک ہی رشتہ حب رسولؐ میں منسلک ہیں۔

''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا''

''پکڑو اللہ کی رسی کو مضبوط سب سے مل کر''

نبی کریمؐ کے دامن میں ہی نصیب ہوتا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ نامِ گرامی نبی کریمؐ پہ فدا ہو جانے کے لئے ہر اچھے بُرے مسلمان میں جذبہ موجود ہے۔ جیسا کہ یہ نسل در نسل اس کے خون میں ودیعت ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے۔

اَلْمُسْلِمُ اَخُوالْمُسْلِم

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے''

یہ بھی فرمایا کہ نہ اس پر ظلم کرے نہ مصیبت میں اسے تنہا چھوڑ دے اور خود بھی اس کا عملی پہلو یہ دکھایا کہ سب کو بھائی کہہ کر پکارتے۔ دیکھا جائے تو اس بھائی چارہ میں کتنی ہمت، کتنی طاقت، کتنا مزہ ہے۔ بھائی چارہ میں تو اچھے برے سب بھائی ہوتے ہیں۔ اسلام نے بنیادِ دین

کُلُّ مُؤْمِنٌ اِخْوَۃٌ

''سارے مومن بھائی ہیں''

قائم کر دی یہ وہ وحدت کا رشتہ تھا کہ فرد کی جمعیت کے ساتھ توحید قائم ہوئی۔ ارشاد نبویؐ یہ بھی ہوا کہ ''دوسرے کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے''۔ اگر ہم صرف اس حدیث مبارک کو ذہن نشین کر لیں تو سارے مسائل اُمت کے حل ہونے لگیں۔ بیچ میں سے ہر تنازعہ کی بات خود بخود ہٹ جائے۔ ایمان کی راہِ توحید میں وہ کیفیت قائم ہو جائے کہ اپنے اور دوسرے میں اُمتیاز بھی نہ رہے۔

جانوروں تک میں یہ توحید فطری جبلّی طور سے عمل پیرا ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں، چیونٹیوں، دیمک وغیرہ کے چھتے یا بستیاں سی ہوتی ہیں کہ سارے کا سارا چھتہ ایک جسم واحد کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے کام علیحدہ علیحدہ مقرر ہوتے ہیں۔ کوئی غیر اس چھتہ میں آجاتے ہیں تو فطری جبلی تقاضوں کے تحت بغیر سوچے سمجھے یا عقل استعمال کئے وہ ڈنگ لگاتے ہیں اور خود مر جاتے ہیں۔ جمعیت کی بقا کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ جبلی تقاضوں کے تحت وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ انسان کو فطری طور پر یہ جبلتیں بھی ملی ہیں، شعور بھی، اختیار بھی۔ اگر صرف جبلتیں ہی ملی ہوتیں تو یہ بھی جبلّت کے مطابق

عمل کرتا۔ زندگی گذارتا۔ مگر شعور اور اختیار جو انعاماً ملا ہے اس کے سہارے ایک طرف وہ صرف حیوان کی زندگی گذارتا ہے تو دوسری طرف ملکوتی صفات بھی رکھتا ہے۔ انسان نے اپنی زندگی کو توازن میں رکھا تو حیوانی اور ملکوتی صفات، دونوں سطح پر رحمت کو سازگار پاتا ہے یہی شعور اور اختیار بے لگام ہو تو جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ایک نفسِ واحدہ یا جمعیت کے رنگ میں جن قوموں نے زندگی گذاری وہ زمانہ میں کافی عرصہ کامیاب رہیں۔ اور جن قوموں نے محض جبلی تقاضوں کے تحت فطری زندگی گذاری، جیسے افریقہ کے بونے وغیرہ تو ان کی جمعی زندگی ہزاروں سال گذرنے پر بھی برقرار رہی حالانکہ بڑی سے بڑی تہذیبیں صرف ایک ہزار سال تک ہی رہ کر برباد ہو گئیں۔

کچھ قوموں نے اقتصادیات کو زندگی کا عملی پہلو بنایا مگر اس کا لائحہ عمل محدود رہا۔ نتیجتاً انفرادیت ابھری، حسد، بغض، مقابلے، لوٹ کھسوٹ میں وہ قومیں لگ گئیں۔ کچھ قوموں نے اشتراکیت کا نظریہ اپنایا۔ جبلی تقاضوں کے مطابق قومی زندگی کو ڈھالا کہ ساری کی ساری قوم ایک جسم واحد کی طرح کام کرے اور قومی زندگی کو ہزاروں سال بقاء مل جائے۔ اس طرح بقائے قوم کی ضمانت تو ہو گئی مگر انسان بھی مکھیوں، چیونٹیوں کی طرح اپنے اعلیٰ مقام سے نیچے گرا دیا گیا۔ اس نظریہ میں اقتصادی برادری ضرور تھی مگر محبت کا جذبہ مفقود تھا۔ کم از کم غیروں سے نفرت تو موجود رہی۔ انسان اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے نا آشنا رہا۔ مقامِ روح تک تو اس کی کیا رسائی ہوتی مقامِ قلب تک سے محروم ہو گیا۔ اس طرح بقائے حیات تو قوم کو مل گئی مگر بقائے دوام نہ مل سکی۔ باطن کی صلاحیتیں پوشیدہ کی پوشیدہ رہیں۔ ہندوؤں نے بھی اپنے نزدیک چار ذات پات کر کے انسان کو فطرت کے مطابق زندگی گذارنے کی راہ دکھانی چاہی۔ مگر کیا

نیکی صرف برہمن تک اور بہادری راجپوت تک محدود تھی۔ اس طرح ہر فرد کی لامحدود صلاحیتوں کو بھی محدود کر دیا گیا اور نفسِ واحدہ سے عالمِ انسانی کی تخلیق کے خلاف بھی یہ بات گئی۔ المختصر جہاں بھی کسی قوم یا تہذیب کا لائحہ عمل عام عالمِ انسانیت سے علیحدہ رکھا گیا یا جہاں ساری انسانیت کو ایک نفسِ واحدہ نہ سمجھا تو وہ تہذیبیں بالآخر اندرونی یا بیرونی کشمکش سے ختم ہوئیں۔

اسلام نے رحمتِ عالم بن کر فلاحِ انسانی کو اپنا نظریہ بنایا۔ کل تخلیق کو ایک نفسِ واحدہ کی صورت میں دیکھا۔ اور اس کے پیچھے جو حقیقت کارفرما تھی اس کا ادائے کل کی صورت میں عرفان کیا۔ سبب اور نتیجہ کی دنیا سے نکل کر ہر سبب کے پیچھے مسبّب الاسباب کو کارفرما پایا۔ یہ سبب اور نتیجہ کی دنیا نہیں ہے۔ کیونکہ آخر معصوم کیوں تباہی، زلزلے، ابتلاؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام سیدھے سادے آدمیوں سے جمعیت اور عالمِ انسانیت کے وہ کام کیوں لے لئے جاتے ہیں جو متقی اور پارسا لوگوں سے نہ ہو سکے۔ دیکھا جائے تو ہنگامۂ زندگی میں مشیتِ کُل کارفرما ہے۔ ساری مخلوق اس کی نگاہ میں کل کی کل ہے۔ ہر واقعہ کو مسبب الاسباب کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر تکلیف کا اثر سب پر پڑنا چاہیے اور ہر سہولت کا بھی سب پر۔ جیسے دنیا میں کسی جگہ بھی کوئی فلاحی دریافت ہوئی تو ساری دنیا نے فائدہ اٹھایا۔ سائنس کی دنیا میں مثال کے طور پر آئن سٹائن کے نظریہ کو اپنا کر لاکھوں جگہ سائنسی میدان میں ترقی ہوئی۔ ڈاکٹری دریافتوں سے، ساری دنیا نے ہی فائدہ اٹھایا۔ رحمتِ عام اس طرح مختلف انداز میں کاروبارِ عالم میں کارفرما نظر آتی ہے۔ بہ ظاہر بربادیوں کے پیچھے بھی نگاہِ بصیرت یہی دیکھے گی کہ رحمتِ کُل بیتاب ہے کہ خلقت اپنی اعلیٰ اقداروں کی جانب گامزن ہو۔ پرہیز گاری پکڑے تا کہ زمین آسمان کی نعمتیں ان پر

کھولدی جائیں۔ سورہ الاعراف میں ہے۔

''اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم کھول دیتے نعمتیں آسمان اور زمین سے لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کے اعمال کے بدلے۔''

میزانِ عمل

تو اب انسان کو اپنی انا کے محدود دائرے سے نکالنے کے لئے اور جمعیت کو ایک نفسِ واحدہ کا پھر سے رنگ دینے کے لئے فی زمانہ کیا کیا جائے۔ سہل راستہ تو یہ نظر آتا ہے کہ

(الف) جس کی ساخت میں سوزِ دل پروانہ والی بات ہو، عشق کرنے کی صلاحیت فطری طور پر ودیعت ہو تو قدرتی طور پر اسے عشقِ رسولؐ عشقِ امت کی راہ ملے گی اور مخلوق کو اللہ کی عیال سمجھے گا۔

(ب) اور دوسری صورت یہ ہے کہ جن میں عشق کی صلاحیت نہیں ان کی فطری جبلتوں کو ایک رخ دیکر تہذیب میں لایا جائے۔ انفرادی اور اجتماعی فلاح کا ضامن بنایا جائے جسم، عقل اور نفسانفسی کے چکروں سے عام انسانوں کو بچانے کے لئے کم از کم وہ سادہ نسخہ اپنایا جائے جو نبی کریمؐ نے بتایا یعنی کم بولنا، کم کھانا، کم سونا۔ مثال کے طور پر فطری جبلت، جنسی رجحان کو لیں۔ جب اسی سادہ نسخہ (کم بولنا، کم کھانا، کم سونا) پر عمل کرتے ہوئے اس رجحان کو تہذیب ملے تو انسان جسمانی خواہش سے ہٹ کر اپنی فطری بے چینی پر آتا ہے جو اس کی روح میں ودیعت ہے۔ ایک نامعلوم سی تلاش، ساتھی کی

تلاش، آہوئے ختن کی طرح ایک ہوک سی محسوس کرتا ہے۔ مگر پتہ نہیں کیوں دراصل یہ اس کی روح کی تڑپ ہے جو اپنے اصل سے ملنے کے لئے بے قرار ہے۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہاشکایت می کند

''روح کی بانسری سے سنو کیا کہہ رہی ہے۔ اپنے اصل روحِ اعظم سے جدائی کی شکایت کر رہی ہے''

اور جن میں یہ استعداد بھی نہیں، یہ فطری جذبہ بھی کمزور ہے، ان کے لئے امر و نہی، احکامِ شرع و آئین کے ذریعہ ایک با اخلاق معاشرہ قائم کرنے کے ذرائع ہیں۔ ان کی تفصیلی وضاحت شرعی قوانین کے ذریعہ کر دی گئی جس کی بنیادیں موسوی شریعت میں قائم کر دی گئیں۔

اس سے آگے عیسوی شریعت تھی جہاں عشق کی کارفرمائی تھی اور جس کی انتہا انا لیلیٰ، انا الحق، مگر یہ موسوی بھی نامکمل بات تھی وہ عیسوی بھی نامکمل۔ اس لئے اسلام نے عالمِ انسانیت کو ایک توازن دیا، میزان قائم کی۔ عام انسانی زندگی میں اس میزان قائم کرنے کا اطلاق ہر فرد پر ہوا، چاہے دوکانداری میں یا تعلقاتِ عامہ میں یا روزمرہ زندگی میں۔

پھر اس سے اعلیٰ سطح پر مقامِ قلب تھا اور اس سے آگے مقامِ روح یہاں بھی ترازو کے دو پلوں کو توازن میں رکھنا تھا۔ اس ارتقائے روحانی کی منازل میں جب باطن میں غوطہ لگایا تو انفاس کی کیفیت خوشبو کی طرح پھوٹی۔ انا کا ایک ہی پلہ نظر آیا یعنی کائنات میرے اندر ہے۔ یہ وہی بات ہے۔ جس

کی بابت حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے فرمایا ' اے بیٹے تم اُمّ الکتاب ہو۔ تمہارے اندر ساری کائنات ہے'۔ اسی باطنی خوشبو کو سورۃ یٰسٓ کی کیفیت کہہ لیں، جو حیاتِ روح کی بات ہے۔ اسی کو نافہء ذات کہہ لیں یا قلبِ قرآن۔ اب اگر انفاس کی جگہ آفاق میں عروج ہوا، اپنی فطری روحانی صلاحیتوں کے آسمانوں میں پھیلے تو ترازو کا دوسرا پلہ آفاق میں نظر آیا۔ آفاق کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ انا فراموش ہوئی، ''مَیں کائنات ہوں'' کا رنگ چڑھا۔ یہ سورہ رحمٰن کی کیفیت ہے۔ سبحان اللہ یہ خیال، یا تصور کی بات نہیں ہوتی بلکہ حقیقت ہے۔ جب اس بات کا حق الیقین ہوگیا کہ ''میں کائنات ہوں'' تو ابھی وہاں ابھی یہاں، ابھی پچاس جگہ۔

اب ان دونوں کیفیات، انفاس، آفاق میں میزان کی بات یہ ہے کہ ترازو کے یہ دونوں پلے ہوں۔ ڈنڈی بھی ہو جو دونوں کو ملاتی ہے۔ مگر ڈنڈی پکڑنے والا ہاتھ نہ ہو تو نہ ترازو کے معنی نہ میزان کے۔ اس لئے جو اپنے دونوں رخ یعنی ظاہر باطن کے کسی ہاتھ میں دیدے وہی میزان میں رہ سکتا ہے۔ اس سپردگی کے بغیر یہ میزان ناممکن ہے۔ مگر یہ ڈنڈی کس کے ہاتھ میں دیں۔ جس پر انفاس غالب ہوتا ہے وہ کہتا ہے میرا ہی تو ہاتھ ہے اور جس پر آفاق غالب ہو وہ کہتا ہے، یہ پلہ بھی مَیں، وہ پلہ بھی مَیں، ڈنڈی پکڑنے والا بھی مَیں۔ لیکن اگر نسبت صحیح ہے تو میزان میں آتا ہے۔ بزرخ شیخ سے سلسلہ بہ سلسلہ اس اتمّ انسانیت پر پہنچتا ہے جو رحمتِ عالمؐ ہے۔ اب رحمتِ محمدیؐ تک رسائی ہوتی ہے۔ وہ خود جانتے ہیں کہ توازن کیسے لایا جائے۔ رحمت کا تقاضا ہے کہ دونوں پلوں سے گھٹاتے کچھ نہیں بلکہ جس میں کمی ہوتی ہے اسے خود پوری کر دیتے ہیں۔ اب کہیں ظاہر باطن کی میزان میں توحید عطا ہوتی ہے جس

جس کے نصیب میں۔

عام مسلمان کیلئے لائحۂ عمل

یہ تو رہیں ارفع و اعلیٰ مقامات کی باتیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ باتیں تو عام انسان کی فہم سے بھی بعید ہیں ۔آخر عام مسلمان کے لئے موجودہ حالات میں کیا لائحہ عمل مقرر کیا جائے۔ اور پھر عملی طور پر جمعیت کے لئے کیا کیا جائے تا کہ بقائے قوم کی ضمانت ملے۔

(الف) ظاہر ہے کہ احیائے اسلام کا پہلا قدم روزمرہ عملی زندگی ہی میں ہونا ہے۔ جمعی زندگی کی بقا اور ارتقاء کے لئے ہر فرد کو اپنی زندگی کو ایک فطری شدّتِ کار اور سچائی میں ڈھال لینا ہے۔عملاً اپنے ہر کردار میں اسلامی جمعی نظریئے کے فروغ کے لئے زندگیوں کو وقف کر دینا ہے۔ فرد کو جمعیت کے لئے جینا سیکھنا ہے۔ ایک رابطہ تخلیق میں سب کو آنا ہے۔ نباتات اور حیوانات تک کی زندگیوں کو دیکھیں تو ان میں حیات بھی ہے، نمو بھی ہے، فروغ بھی اور ارتقاء کی دھیمی چال بھی ہے جو صدیوں میں طے ہوتی رہتی ہے۔ ساری کی ساری مخلوق ایک دوسرے سے رابطہ میں ہے۔ ایک توحیدی اور ایکائی کی کیفیت میں ہے۔ انفرادیت کی انفرادیت ہے اور اجتماعیت اور گروہ بندی بھی۔ اس اجتماعیت میں وہ ایک دوسرے کے مدو معاون بھی ہیں اور برسرپیکار بھی۔ مگر یہی سب کچھ ان کی زندگیوں کا سہارا بنا ہوا ہے۔ حیاتِ نباتات، حیاتِ حیوانات میں ضَم ہے۔ اور سب حیات، الحیات میں سب کچھ دیکھیں تو ایک سلسلہ حیات جاری ہے۔ ایک نظامِ

فطرت پوری یکتائی میں اس سب زندگی اور الحیات کے پیچھے کارفرما نظر آرہا ہے۔ ایک عجیب یکتائیتِ توحید اس سب نظام میں نظر آرہی ہے۔ نمو، نشو ونما، تولید، سلسلہ نسل، ارتقاء کس خوبی سے جاری ہے اور کیسے اجتماعی توحیدی انداز میں۔ یہ اجتماعی انداز ہی توحیدِ فطرت ہے۔ حیات کو دیکھیں تو نہ کوئی چیز فنا ہو رہی ہے، نہ کسی چیز کو بقائے دوام ہے، الحیات کو بقائے دوام ہے۔، بیکار اشیاء کی جگہ کار آمد کو دی جارہی ہے۔ طاقت ور کو دی جارہی ہے۔ جس میں مادی جسمانی طاقت اور ذہنی طاقت ہے وہی سربلند ہے اور جمعیت میں تو بے پناہ قوت ہے۔ انفرادی اجسام کو دیکھو یا اجتماعی طور سے نظامِ عالم میں دیکھو، اندر دیکھو، باہر دیکھو حیات ہی حیات ہے۔موت عارضی ہے۔ مادی سطح پر لے لو یا کسی سطح پر، ہر موت کے بعد نئی حیات ہے۔ جیسے کہ ہر نئی حیات کے لئے موت لازمی سی شے ہے۔ نباتات ختم ہو کر کھاد بن جاتے ہیں یا غذا یا ایندھن، کہ بہتر حیات جاری رہے۔ حیوانات میں بھی یہی سلسلہ نظر آرہا ہے۔ کہ اپنے سے بہتر حیات والے حیوانات کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ ہر ناخوب کی جگہ خوب کو مل رہی ہے۔ نباتات کو دیکھو، حیوانات کو دیکھو یا انسانوں کو، سب غیر حق کو فنا ہو رہی ہے۔ حق کو بقا ہے۔ فطرت کے قانون نہ نباتات کے لئے بدلتے ہیں نہ حیوانوں کے لئے، نہ انسانوں کے لئے ''وَجْهُ رَبِّكَ'' کو بقا ہے۔ یہ ''وَجْهُ رَبِّكَ'' کی مادی سطح ہے۔

(ب) اس سے اوپر کی منازل قلب و روح کی بات کچھ اور ہے۔ مگر میزان ایک ہی ہے۔ قانون وہی ایک سنتِ الٰہی ہے۔ نفس کی فنا، تو لطیفۂ

نفس میں بقا۔ لطیفہ نفس کی فنا تو قلب میں بقا۔ مقامِ قلب کی فنا تو مقامِ روح میں بقا۔ یہ فنا در فنا کی منازل ہی حیاتِ نو کا ذریعہ ہیں۔ باطن کی حیات کا سلسلہ ہیں۔ ارتقائے باطن کا ذریعہ ہیں۔ الغرض ہر انسان کے اپنے وجود، جسم، جان، نفس، قلب، روح میں یہی فطرت کا اصول اب بھی جاری و ساری ہے۔ بچہ اب بھی جہاں پیدا ہوا، اسلام پر پیدا ہوا۔ پوری امن وسلامتی کا پیکر، پورا نائب بنکر۔ فطرت کی سادگی، معصومیت، ظاہر باطن کی میزان میں، اندر باہر ایک ہی یکتائیتِ توحید میں اسلام کا پہلا سبق توحید، اسی بچے کی عملی تصویر میں نظر آرہا ہے۔ بچہ معصوم بھی ہے، مختار بھی ہے۔ نمو وفروغ کی شان بھی لئے ہے، ارتقائی مدارج کی طرف گامزن بھی ہے۔ حیات و زندگی کا ایک زندہ توحیدی پیکر بنا ہوا ہے، دینِ فطرت کا شاہکار بنا ہوا ہے۔ بڑا ہو کر بھی اسی فطری اسلامی سادگی اسی اندر باہر کی ایکائی ظاہر باطن کی توحید میں رہا تو مُوَحد کہلانے کا حقدار ہے۔ یہ توحیدی رنگ، انسان کی صداقت کی زندگی، معاشرہ اور جمعیت کے ساتھ صداقت کی ہم آہنگی میں چھلکتا ہے۔ وہی اپنی ضروریات کی طلب میں شدت کی یک رُخی، وہی انہماکِ کار، وہی جذبات میں شدّت کی ہم آہنگی، جسم، جان، قوی اور دماغ کی یک رُخی کہ کسی دھن میں لگ جائے تو پوری صداقت اور پورے وجود کے ساتھ محبت کرے، خدمت کرے، کام کرے تو پورے وجود سے۔ یہی تو اس سطح پر ظاہر باطن کی توحید ہے۔ اور اندر کچھ ہو، باہر کچھ، جسم کہیں، دماغ کہیں، نیت کچھ، عمل کچھ، دل کہیں، خیال کہیں، اور صرف حیوانی سطح پر زندگی

گذار لی تو کیسی توحیدِ ظاہر باطن۔ کیا کاروبارِ زندگی، اور کیا ارکانِ دین کی پابندی۔ جب تک بنیاد صحیح نہ ہو، فطری صلاحیتیں یک رخی میں بروئے کار نہ آئیں، باطنی قوتِ کُن میں اس شاہکارِ قدرت کا ظاہری عمل بھی بے ترتیب، بے مقصد، بے تعین ہوگا اور بغیر کسی نصب العین کے حصول کے لئے ہوگا۔

حکمائے باطن کی عمل پیرائی

آج دیکھا جائے تو ہر فرد کو اپنی اپنی انفرادیت کی لگی ہے۔ کہیں حسد ہے، بغض ہے تو کہیں مقابلے میں نفسانفسی ہے۔ ان کو کیا رخ دیا جائے۔ کیسے اس نفسانفسی کی صلاحیت کو توازن میں لایا جائے۔ حال یہ ہے کہ کہیں ذخیرہ اندوزی ہے تو کہیں حرام آمدنی جمع کرنے کی کوشش۔ حالانکہ ارشادِ گرامیؐ ہے۔ ''غلہ گھروں میں رکھنے والا محروم و بد بخت ہے۔'' ''جس نے مسلمانوں پر انکی خوراک کا ذخیرہ رکھ لیا تو اللہ تعالیٰ اسے جذام اور تنگدستی میں مبتلا کر دے گا۔'' ''وہ گوشت جس نے حرام سے پرورش پائی جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' مصلحین کہتے ہیں بُرائی ہر ایک میں سے نکل جائے، ہر کوئی نیک ہو جائے تو قوم نیک ہو جائے گی۔ مگر یہ بھی تو دیکھنے میں آیا ہے کہ صرف ظاہر کی سطح تک اصلاحی عمل کرانے سے عبادات تک کے باوجود رقابتیں، حسد، بغض، مَیں بڑا تُو چھوٹا، کسی سطح پر بھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ اس لئے عملی اصلاحی صورت یہی نظر آتی ہے کہ باطنی راستے سے یعنی قلبِ روح کی سطح سے ان برائیوں کو نیکیوں میں بدلا جائے۔ انسانی فطرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اس کی برائیوں کو لطافتوں میں صعود کریں تو یہی نیکی بن جاتی ہیں۔ کتنی پیاری بات ہے کہ گناہ نیکی میں

بدل جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ارشاد باری ہے۔ ''یُبَدِّلُ السَّیِّئَاتِ مِنَ الْحَسَنَات'' گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو گناہ کیا ہے؟ نیکی سے دور ہو جانا۔ اس لئے اصلاح کا آسان طریقہ یہی ہے کہ انسان کا فطری باطنی توازن پھر سے قائم کرا دیا جائے۔ یہی کچھ ایک طبیب جسم کی صحت کو توازن میں لانے کے لئے کیا کرتا ہے۔ جب جسم کی تین خُلطوں کا توازن بگڑ جاتا ہے تو حکیم نبض دیکھ کر جس چیز کی کمی ہے اسے پورا کر کے توازن میں لے آتے ہیں۔ اسی طرح باطن کے حکماء کرتے ہیں۔ باطن کی سطح پر اصلاح کے لئے، شعور اور عقل کی سطح پر عمل کرانے کا بھی سوال نہیں ہوتا۔ طریقت والے اس برائی کو نیکی میں بدلنے کے لئے اپنی محبت دے دیتے ہیں۔ اس کی مثال کچھ مادی سطح پر ایسی ہے کہ سورج کی روشنی میں سارے رنگ ہوتے ہیں۔ روشنی کے راستے میں سرخ شیشہ رکھ دو تو اس میں سے صرف سرخ روشنی چھن کر جاتی ہے۔ باقی رنگ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ گویا مخصوص اسمائے الٰہی کی روشنی باطن پر پڑتی ہے اور باقی سب ناپسندیدہ اثرات علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ توجہ کُلّی کی بات ہے جو بہ امر باللہ کر دی جائے تو جس کسی میں کوئی جزو کی کمی ہوتی ہے وہ اس توجہ کُلّی میں سے خود جذب کر لیتا ہے۔ حقیقت والے جب محبت کی توجہ کرتے ہیں تو اس محبت میں سے جس چیز کی کمی اس انسان میں ہوتی ہے وہ اس تک پہنچ جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس توجہ میں عقل و شعور کی سطح کی بات ہی نہیں اور اس طرح باطنی توازن قائم کرا دینے کی سطح بھی ظاہری عقل و شعور سے تعلق نہیں رکھتی۔

ان باطن کی راہوں سے فطری جبلّتوں کے لطافتوں کی جانب صعود کی بات بھی ایسی ہو جاتی ہے کہ ناخوب صلاحیتیں تک، خوبیوں میں تبدیل ہو جاتی

ہیں۔ مثلاً ڈر ایک فطری جبلّت ہے۔ ڈرنا، بزدلی ہے اسے ناخوب یا گناہ کہہ لیں۔ تو اس کو خوب یا نیکی میں بدلنے کے لئے سادہ سا طریقہ بتا دیا کہ کسی سے نہ ڈرو، صرف اللہ سے ڈرو اس کے لیے طریقہ یہ تقرر ہوا کہ جب یہ امر باللہ باطن میں اسمائے الٰہی کا ذکر یا محبت کی توجہ دے کر، عشق کی چنگاری لگا دی جائے تو اب یہی فرد محبوبؐ کے نام پر جان تک دے دینے سے نہیں ڈرتا۔ محبوب سے دوستی یا محبوب کے ساتھ کا باطنی یقین اور ایمان ہو جانے کے بعد وہ فرد، غم و خوف سے نجات پاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ارشاد باری ہے۔

اَلا اِنَّ اَوْلِیآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

''سنتے ہو اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہے نہ غم''

یا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا

''نہ ڈرو نہ غم کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے''

اسطرح جب کسی فرد کو اللہ کے ساتھ ہونے اور اس کی دوستی کا یقین ہو جائے تو اس کی ساری کمزوریاں، ایمانی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی بہت سی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل ہو جانے کی راہ مل جاتی ہے۔ یہ باطنی طریقہ ہی فطری جبلّتوں کو جن کی بنیادیں وجودِ انسانی میں ہزاروں، لاکھوں سال پرانی ہوتی ہیں لطافتوں کی جانب صعود کرنے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً حضرت آدم کی اولاد ہونے کی حیثیت سے فطری احساسِ گناہ، انسان کی جبلّت بن گیا ہے۔ یا بعد ازاں نسل اور نسب کا غرور، اس کی زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ تو جب بھی باطن میں عشق و ایمان کی روشنی ملی، تو ہر ناخوب صلاحیت، خوبی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ''رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا'' اے رب ہم نے اپنے نفسوں

پر ظلم کیا۔ کہہ کر رب کی طرف رجوع ہوئے، توبہ سے رحمت کا دروازہ کھلا۔ اسی طرح اپنے غرور کو چھوڑ کر اللہ کی کبریائی دیکھی، اللہ اکبر کہا۔ اپنے گناہ نیکی میں بدلے۔

ظاہر میں جمعی فلاح

یہ تو رہی باطن کی بات۔ عشق کی فطری صلاحیت کی بات۔ یا اور ادو اشغال میں فطری خلوص آجانے کی بات۔ مگر ان لوگوں کے لئے جن میں یہ باطنی صلاحیتیں کمزور ہیں کیا کیا جائے۔ ظاہری سطح پر عملی طور سے قوم کے لئے کیا کیا جائے۔ ابتدائی قدم پہ نظر آتا ہے کہ انسان کو اپنی بخشش، اپنی توبہ کے تصور سے نکال کر جمعیت کے تصور میں لے آئیں تا کہ جمعی زندگی کو ایک نیا رخ ملے۔ دُعا کرتے وقت تو انسان بہت پُر خلوص اور صادق ہوتا ہے۔ اس خلوص اور صدق کو جمعیت کے لئے وقف کیا جائے تب کہیں انسان دعاؤں تک میں اپنی نفسانفسی سے نکل سکتا ہے۔ ارشادِ باری بھی ہے کہ جتھوں میں اٹھائے جاؤ گے تو ظاہر ہے کہ دنیوی زندگی بھی جمعیت کے رنگ میں گذارتی ہے۔ جمعی فلاح کے لئے اسلام نے سبق دیا کہ ''جو اپنے بھائی مسلمان کی ضرورت کو پورا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورتوں کا کفیل بنتا ہے۔'' سورہ الحشر میں ہے۔ ''یہ انصار ایسے ہیں کہ وہ بھوکے اور محتاج ہونے کے باوجود دوسرے مسلمانوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ جب دعا کرتے ہیں تو کہتے ہیں اے اللہ ہماری مغفرت فرما اور ہمارے دلوں میں ان کے لئے کسی قسم کا کھوٹ پیدا نہ کر جو ہم سے پہلے ایمان سے گذرے ہیں۔'' گویا مغفرت کی طلب بھی جمعیت کے لئے ہے۔ جمعیت کے لئے دعا کرنے کا ارشاد نبی کریمؐ نے ایک دفعہ یوں فرمایا۔

واقعہ ہے کہ ایک بدو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا، اے اللہ مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما۔ حضور اکرمؐ کو جمعیت اتنی محبوب تھی کہ آپ نے فرمایا۔ ''اس دعا میں سب کو شریک کر دے کیونکہ اللہ کا رحم بہت وسیع ہے۔'' تو گویا دعا میں سب کو شریک کرنا ہی دعا کی جان ہے۔ ہماری افراتفری کا سبب ایک ہی نظر آتا ہے کہ ہم ایسی انفرادیت میں پھنس گئے ہیں کہ دعا بھی کرتے ہیں تو اپنے اپنے لئے حالانکہ ہم رحمۃ لّلعالمینؐ کی اُمت ہیں۔ رحمت لّلعالمینؐ کا احسان جس نے قبول کر لیا وہ خوش نصیب ہے۔ پھر وہ بجائے انفرادیت کے رحمت کے دامنوں میں ہوتا ہے۔

اپنی اسی انفرادیت سے ہٹ کر جمعی نظریہ اپنا لینے کے لئے ظاہر کا سادہ سا نسخہ یہ ہے کہ ہم لوگ ایمان، سے دل سے قسم کھالیں کہ میں خوب دعا کروں گا۔ گڑ گڑا کے کروں گا۔ لیکن اپنے لئے نہیں۔ اور اس دعا میں میرا یا میرے متعلقین کا شائبہ نہ ہوگا، تو جمعیت کی پُرخلوص دعا کا اثر ہو کر رہے گا۔ زیادہ نہیں چند ہی یہ کر کے دیکھیں، جھوٹ موٹ ہی سہی۔ ایکٹنگ ہی سہی تو اسمیں صداقت آجائے گی۔ کیونکہ حق کا راستہ ہے۔ یہ دعا بھی وسیلہ رحمت سے ہوگی۔ اور اس دعا کی بات یوں بھی فرد کی سطح نہیں ہے۔ صرف جمعیت کی پر خلوص دعا ہی قبولیت کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ یوں بھی دیکھیں تو اپنی ان لمبی چوڑی انفرادی دعاؤں سے قوم کا کیا بن رہا ہے۔ جمعیت کی بات تو رحمتوں کے دامن کی بات ہے۔ رحمت کے معنی سمجھیں علّت ومعلول کے چکروں میں کیوں پڑیں۔ اپنے گناہوں کا کیا رونا روئیں۔ جب کرم اور رحمت کی بات ہو رہی ہو تو برائی بھلائی کا کیا سوال۔ محبوبؐ کے صدقے میں، اُمت پر رحمت نازل ہوگی۔ درود تاج اس ذاتِ مبارکؐ سے شعوری اور لاشعوری رابطہ قائم کرنے کا

ذریعہ ہے۔

مسلمان کو مِنْ حَیْثُ القوم، درود تاج ہی کو اپنی مشعل زندگی بنانا ہے۔ اور اس درود میں قصیدہ بردہ شریف کا سوز آتا ہے۔

رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمْ

فرد کو اس طرح حبیب پاکؐ کی اُمت سے لگاؤ کا راستہ بتا کر اس کی انفرادی زندگی تک کے لئے ایک نصب العین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ صحیح باغبانی اور صحیح گلہ بانی کے ہوتے ہوئے، پودا اور جانور تک بھی اپنی اصلیت کبھی نہیں کھوتا اور ایک تہذیب میں آجاتا ہے۔ یہی اس کی نشو ونما میں اور ارتقائی منازل کی طرف ترقی کرنے میں اس کے ذرائع بنتے ہیں اور اس راہِ بقا اور ارتقاء میں اس کی اعانت کرتے ہیں۔ اسلام بھی یہی کچھ انسان کے ساتھ کرتا ہے کہ اسے ایک تہذیب و شائستگی عطا کرکے، اس کی فطری نشو، فروغ اور ارتقاء میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ جو فطری صلاحیتیں، جسمانی، ذہنی، اخلاقی انسان کو عطا ہوئی ہیں ان کو، حصولِ مقصد کے لئے شدتیں نصیب کرتا ہے۔ ایک منفرد اور محدود کوشش سے ہٹا کر اجتماعی کوششوں کے پھل عطا کرتا ہے۔ اسلام کی ساری تعلیمات، ساری اسلامی زندگی، سارے اسلامی ارکان اسی جمعیت کے نظریئے کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے نہ ہوئے تو پھر ذاتِ حق کو انسان کے لئے یہ پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل قرآن تو انسانِ کامل ہے۔ جو اپنی زندگی میں قرآن کی عملی تصویر بنا ہوتا ہے۔ اُمت کا درد، محبوب کی سنت ہے جمعی فلاح اسلام کا احسان ہے۔

اپنی انفرادیت سے نکل کر جمعی تصور میں آجائیں تو جمعی فلاح کے نصب العین کو اور فروغ ہی ملتا جائے۔ فروغ کی بات یہ ہے کہ جیسے علم کا محرک نظریہ یہ ہے کہ جتنا علم بڑھتا جائے گا اتنا ہی علم کے دائرہ کا محیط بڑھتا جائے گا۔ اور دائرہ کے باہر جو نامعلوم ہے وہ بھی اسی حساب سے بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح نصب العین بھی اگر محرک ہو، جیسا کہ اُمت کا دردتو یہ اور بڑھتا ہی جائے۔ بڑھتا ہی جائے تو اور بات بنتی چلی جائے۔ اور جمعیت کے قلوب میں محبت کا ایک چین ری ایکشن سا شروع ہو جائے۔ محبتوں کے دامن میں رحمتوں کے سایہ میں انفرادی عروج کے لئے نصب العین تو بتا دیا گیا۔ یہ ظاہر باطن کی میزان میں زندگی گذارنا ہے۔ اس کی اعلیٰ سطح حقیقتِ محمدی تک رسائی، ''بلغ العُلٰے بکمالہٖ''۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے یہ نصب العین کس صورت میں بروئے کار لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نصب العین ایسا ہو جس میں جمعیت کے لئے جاذبیت بھی ہو، فروغ کُن بھی ہو، ارتقاء بھی، دائمیت بھی ہو اور ساتھ ہی بنیادِ وجودِ انسانی سے ہم آہنگ ہو۔ تاریخِ انسانی پر ایک محققانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ علمی یا سائنسی نکتہ نگاہ سے کسی قوم کی بڑائی کا سبب اس کا وہ نصب العین ہوتا ہے جس میں دائمی اقدار ہوں۔ اسی کے ساتھ اس قوم کے فروغ کا باعث اس کا وہ عزم و حوصلہ ہوتا ہے جو اسی نصب العین پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اسے حاصل ہوتا ہے۔ پھر یہی عزم و حوصلہ اس کے عروج کا ضامن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں بڑی بڑی قومیں اپنی عمرانیت اور تہذیب کو لے کر نمودار ہوئیں کچھ عرصہ دنیا میں رہیں۔ چاند ستاروں کی طرح چمکیں پھر غروب ہوگئیں۔ ان میں سے کچھ ایسی غائب ہوئیں کہ اپنا نام ونشان تک نہ چھوڑا۔

اسی طرح اس دنیا میں مختلف جانوروں کی ایسی ایسی قسمیں اور نسلیں آئیں جن کا شاندار دور دورہ رہا۔ مگر پھر ایسی مٹ گئیں کہ آج ماہرِ ارضیات وحیوانات ہی ان کا کچھ پتہ دیتے ہیں۔

ایک غائت نظر سے تمام جمادی، نباتی، حیوانی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ زندگی اور حیات کے کچھ ایسے فطری اصول ہیں جن پر چل کر بقاء ارتقاء اور پائدار اقدار نصیب ہوتے ہیں۔ فطرت ہر نا اہل کی جگہ اہل کو دیتی ہے۔ حیات کے تسلسل کے لئے اہلیت اسی کو نصیب ہے جو ماحول کا نہ صرف مقابلہ کر سکے بلکہ جو ماحول کے مطابق اپنے میں بدلنے کی صلاحیت اور لچک رکھتا ہو۔

قوم کی رُوح

پرانے دانشوروں کا کہنا ہے کہ جیسے ایک فرد کی روح ہوتی ہے جو اس کی زندگی کی دمک اور ارتقاء کے لئے اس کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور ایک مقررہ عرصہ تک اس کے جسم میں رہتی ہے جسے ستر یا سو سال کہ لو، اسی طرح قوم کی ایک روح ہوتی ہے۔ جس کی عمر اندازاً ہزار سال ہوتی ہے۔ تاریخ اس نظرئے کی حقیقت کی بہت کچھ تصدیق کرتی ہے۔ افراد پیدا ہوتے ہیں۔ زندگیاں گذارتے ہیں۔ لیکن جو چیز آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں وہ ان کا کلچر ہے۔ اسی کلچر میں ایک پیغام، ایک نصب العین، عالمِ انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔ اسکی کو دیکھ کر نگاہِ بصیرت رکھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آگے کی نسلیں ترقی کی طرف جارہی ہیں یا تنزل اور بربادی کی جانب۔ کسی کلچر کی ضمنی شکلیں اس کی اقتصادی خوشحالی، رہائش وتہذیب کی بلندی یا قوم کی طاقت وقوت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مگر تہذیب کی ان ظاہری بلندیوں کو نصب

العین بنایا جائے تو ان میں سے ہر ایک ہی بذاتِ خود اس قوم کی تباہی کے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ نہ اقتصادی خوشحالی، نہ مال و دولت، نہ عیش وعشرت کے سامان اور نہ ہی قوت وعظمت میں، انسان کے ارتقاء کے سامان ہیں۔ نہ ہی اس قوم کی سربلندی کے لئے یہ دائمی اقدار ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفہ بھی کسی قوم کا کلچر نہیں کہلائے جاسکتے۔ گو اسی قوم کے عروج اور حصولِ مقصد کا اندازہ ان کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔

فطری میزان، حیات و بقا کا ضامن

قانونِ فطرت کے مطابق زندگی گذارنے میں حیات اور بقا ہے۔ اس حیات کی نشانی ارتقا ہے جو فطرتاً ہر جاندار شے کو عطا ہوئی ہے۔ اور وہ لوچ اور لچک ہے جو ماحول کے مطابق اپنے میں تبدیلی لے آتا ہے۔ جو قومیں اپنی میزان حیات سے اوپر یا نیچے ہوجاتی ہیں، جن میں ماحول کے مطابق ساز گار ہوجانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے وہ بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ جب کسی تہذیب کا مرد، مرد نہ رہے اور عورت نسوانیت کی میزان سے ہٹ جائے تو وہ بالاخر ختم ہی ہو کر رہتی ہے۔ جب کوئی فرد یا جمعیت اپنی انفرادی زندگیوں کو قدرت کے فطری قانون سے متجاوز کرنے لگتے ہیں تو فنا ہو جاتے ہیں۔ تمام نسلِ انسانی ایک ہی میزان پر پیدا کی گئی تھی۔ جب تک یہ فطری میزان برقرار نہ رہے گی زمانہ میں جنگ وفساد، اقتدار اور افلاس کی ہی اونچ نیچ ہوتی رہے گی۔ فطرت اور مقصد تخلیق کے تقاضوں کے برخلاف دیکھا یہ جارہا ہے کہ تہذیب کے ارتقاء میں انسان جسمانی طور سے کمزور سے کمزورتر ہوتا چلا جارہا ہے۔ گو اس کی عقل لگاتار بڑھ رہی ہے۔ البتہ اس ذہنی ارتقاء میں انسان نے

یہ ضرور جان لیا ہے کہ جمعی عمل کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ آثارِ قدیمہ کے محققین بتاتے ہیں کہ پچاس ہزار سال پہلے اولین معاشری گروہ وجود میں آیا۔ اسی سے بعد میں خاندانوں، قبیلوں، گاؤں اور شہروں نے جنم لیا۔ اس ارتقاء اور ترقی کی بنیادی وجہ دیکھیں تو اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اپنی حفاظت اور بقاء کی فکر ہی تھی کہ انسان نے گروہ اور جمعیت کی زندگی کی طرف قدم اٹھایا۔ اس بقائے حیات اور بقائے نسل کے مختلف نقشے تاریخ کے اوراق پلٹ کر یا حیوانی زندگی کا مطالعہ کر کے حاصل ہوتے ہیں۔ اگلی نسلوں کی حیات کی بقا کی خاطر اکثر گروہ کے گروہ حیوانوں کے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ یہ گویا بقا کا منفی پہلو ہے۔ قدرت کی تباہ کرنے والی قوتوں کے مقابلہ میں بقا ہے۔ اس میں بھوک، بیماری، موسم، ناگہانی حادثات، خطرات زلزلے، آتش فشاں، قحط، خشک سالی وغیرہ آتے ہیں۔ انسانی تہذیب اب کہیں ترقی کرتے کرتے بقاء کے اس منفی پہلو تک پہنچی ہے کہ ان چیزوں سے اس نے نجات پالی ہے۔ لیکن فطرت میں جمود کے معنی موت کے ہیں۔ محض زندگیاں گذار لینا مقصدِ حیات نہیں۔

جس حیات میں ارتقاء کی جھلک نہیں وہ موت ہے۔ جدوجہد، کوششِ پیہم، فطری ارتقاء ہی بقا اور ارتقاء کے ضامن ہوسکتے ہیں۔ جب قومیں تن آسانی میں مطمئن ہوگئیں یا صرف اپنی انفرادی زندگی تک کی جدوجہد میں مشغول ہوکر رہ گئیں، آئندہ نسلوں کی حیات کی ضمانت سے اپنی نظریں ہٹا گئیں یا عالمِ انسانیت کی حیات کی طرف سے لاپرواہ ہوگئیں تو گویا نزول کی جانب قدم رکھا اور بالآخر آہستہ آہستہ مٹ کر رہیں۔ اسی لئے ضروری ہے کہ بقا کے مثبت پہلو پر ہمیشہ نسلِ انسانی کی نظر ہو۔ یہ مثبت پہلو یہی ہے کہ اپنی زندگی کو نہ صرف قائم رکھنا ہے بلکہ آگے ارتقائی منازل کی جانب بھی اس زندگی کو آئندہ

نسلوں کے لئے لے جانا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہر انسانی گروہ کو یہ نکتہ جاں گزیں کر لینا ہے کہ فطرت میں ہر چیز، ہر شے، ہر جاندار، ہر شخص اپنے کو باقی رکھنے کے لئے نہیں بلکہ دوسرے کو باقی رکھنے کے لئے زندگی میں آیا۔ یہ دوسروں کی حیات کی ضمانت بن جانا ہی بقا ہے۔ فرد فانی، جمعیت کو بقا ہے۔ اور اسی لئے موجودہ جمعیت کی زندگی اس کوشش میں صرف ہوتی رہے کہ اپنے سے بہتر جمعیت اگلی نسلوں میں وجود میں آئے ۔ اور یہ جمعیت کی زندگی کچھ ایسے فطری ارتقائی اصولوں پر چل رہی ہو کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ہر جمعیت کی زندگی ارتقاء کی کڑی میں فطری نصاب اور توازن پر قائم رہے۔ فطرت کے اصول عالمِ انسانیت کے لئے عام ہیں اور ان سے بہتر کونسے اصول ہوسکتے ہیں جو خود حق نے عالمِ انسان کی روزمرّہ زندگی کی ظاہری باطنی میزان میں ہے۔ نہ صرف ظاہری ارتقاء بذاتِ خود اس توازنِ حیات کا ضامن ہوسکتا ہے اور نہ ہی صرف باطن کا عروج۔ ظاہر، باطن کو ایک ہی توحیدی میزان میں رکھے ہوئے زندگی گذارنا ہی اصولِ فطرت ہے۔ نسلِ انسانی نے ظاہر کا کافی عروج حاصل کرلیا ہے۔ اب ظاہر کے علاوہ باطن کی طرف بھی نظر کرنی ہے۔ تا کہ انسان کی پیدائش کا اصل مقصد معلوم ہو سکے اور انسان خود اندازہ لگا لے کہ کہاں تک وہ ظاہری اور باطنی فطرت انسانی کے تحت زندگی گذار رہا ہے۔

میزانِ ظاہر و باطن، کلمہ طیّبہ

اسی مقصدِ تخلیق کی طرف جب انسان نے رجوع کیا تو مذاہب کا وجود آیا۔ اسی فطری جذبہ تلاشِ حقیقت کے تحت انسانی زندگی میں مذاہب کا بھی اسی

ظاہر باطن کی میزان میں ارتقاء ہوتا رہا۔ جب بھی انسانی زندگی صرف ظاہر یا صرف باطن کی جانب رجوع ہوئی تو وہ اہلِ مذاہب بھی میزان سے ہٹے اور مذہب کا خول ہی خول رہ گیا۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ تک تمام ابتدائی مذاہب ارتقاء کا منفی انداز لئے تھے۔صرف ظاہر سے برسر پیکار تھے۔ممنوعات کی طرف ہی زیادہ رجوع تھے۔ کہ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ البتہ انسانیت کے ارتقاء اور باطنی ترقی کی جانب بھی مثبت قدم اٹھانے کا انداز عشقِ عیسوئی سے باطن اجاگر ہونے کے بعد اسلام کے زمانہ میں آیا۔ اسلام ہی وہ مذہب تھا جس نے منفی اور مثبت کی میزان قائم کی یعنی یہ نہ کرو اور وہ کرو کی۔ یہ نہ کرو میں صرف بقا کا پہلو تھا۔ وہ کرو کے انداز میں ارتقاء کی جھلک تھی۔ اسی لئے مختصراً حاصلِ زندگی کلمہ:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ہوا۔ یہ کلمہ توحید، منفی مثبت کی میزان میں تھا۔ اس میں منفی مثبت دونوں پہلو تھے۔ بقا کا رنگ بھی تھا اور ارتقاء کا بھی، ہر غیر اللہ کی لا بھی تھی۔ اور اللہ کی طرف رجوع بھی، نہی عن المنکر بھی تھا اور امر بالمعروف بھی۔ اس کے بعد ہی کہیں بقا تھی۔ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کے رحمت کے انواروں میں بس کر ہی توحیدِ کلی حاصل ہوتی تھی۔ اب کہیں نہ صرف زندگی کے سرچشموں میں بقا تھی بلکہ ارتقاء کی منزل اِلَیْهِ رَاجِعُوْن کی جانب رجوع تھا۔

ڈارون کا فلسفۂ جہد للبقاء اور اِرتقاء واضح کرتا ہے کہ پائیدار اقدار کے نکتہ نگاہ سے، ذہنِ انسانی جو نسلِ انسانی اور انسانیت کی سب سے بڑی دولت ہے، سوائے ماحول کے مطابق تبدیل پذیر ہوجانے کے دوسری چیز نہیں۔

ارتقائے انسانی کے لئے یہ لچک اور لوچ ضروری ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسانی زندگی میں وہی اقدار قائم رہتی ہیں جو ماحول کے مطابق بقاء کی صلاحیت بھی رکھتی ہوں اور ماحول کے مطابق اپنے میں تبدیلی بھی پیدا کر سکیں تا کہ ارتقاء جاری رہے یہ کچھ ایسی بات ہے جیسے کہ سمندر کی لہروں اور طوفان سے لڑنے کی بجائے ان پر سواری کی صلاحیت پیدا کر لی جائے۔ انسانی عظمت کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے۔ اسلام نے انسانیت کو یہی آئیڈیل دیا کہ شرفِ انسانیت تقویٰ میں ہے۔ جمعیت بندی میں ہے۔ انسانیت پر رحمت بن کر چھا جانے میں ہے۔ تا کہ انسان صحیح معنوں میں خلافتِ ارضی کا مصداق ہو اور ساری مخلوق عیال اللہ کے رنگ میں زندگی گذارے۔ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللہ کے نظریے کا جواب نہ یونانی فلسفہ دے سکا نہ کوئی دوسرا فلسفہ کمیونزم یا سوشلزم، اور نہ ہی کوئی دوسرے مذہبی نظریات جیسے برہمیت، یہودیت، عیسائیت وغیرہ۔ فطرت معصوم ہے۔ تخلیق کی بنیاد حب اور عشق ہے۔ زندگی کے معنی خالق اور مخلوق کے رابطے کی بات ہے۔ خلیفہ اللہ کے مقام سے مادی، اخلاقی، روحانی زندگی کی جمعی توحید میں شرف انسانیت حاصل کرنے کی بات ہے۔ اسلام کے علاوہ دوسرے جو آئیڈیل تھے ان میں سے کچھ اتنے تخیلی تھے کہ ان پر عمل درآمد کرنا ممکن نہ تھا۔ اگر چہ ان میں سے بہت سے مستحسن اور قابل تعریف بھی تھے جیسا کہ جین مت، بدھ مت اور عیسائیت وغیرہ۔ اور کچھ ایسے بھی تھے کہ ان میں ظاہری سختی اور جمود اتنا تھا کہ کہ ارتقائی منازل کی طرف نہ لے جا سکتے تھے۔ خصوصاً ارتقاء کے اس نکتہ کی طرف کہ ارتقاء لوچ اور لچک کے ذریعہ ہی ممکن ہے اب موجودہ زمانہ میں انسانیت اس مقام تک پہنچ گئی ہے کہ کسی قوم کی بڑائی کا اندازہ اس کے آئیڈیل، نصب العین یا مذہب سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ

آئیڈیل یا مذہب وہ نہیں جو اس کی کتابوں میں ہے۔ یا ظاہری ارکانِ دین کی پابندی میں ہے۔ بلکہ وہ مذہب اور آئیڈیل جو یہ قوم اپنی زندگی کے روز مرّہ عمل و کردار میں دکھا رہی ہے۔ یہ روز مرّہ عملی زندگی اگر فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، بقا اور ارتقاء کی شاہ راہ پر گامزن ہے تو اس قوم کی آئندہ نسلیں خوش نصیب ہیں۔ روز مرّہ زندگی کے ہر پہلو میں اس آئیڈیل کا اظہار ہی اس قوم کی آئینہ داری کرسکتا ہے۔ وگرنہ ایک ذہنی یقین یا ایمان کسی قسم کے آئیڈیل میں کسی قوم کو نصیب ہونا بھی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کوئی شخص (یا قوم) اس آئیڈیل کے مطابق زندگی بھی گذار رہا ہے۔ جب تک افراد میں یہ آئیڈیل، یہ نصب العین ان کی روز مرّہ سادہ زندگی میں کلی طور پر جذب نہ ہو جائے اسے وہ گہرائی نہیں ملتی جسے یقین، ایمان یا مذہب کہا جاسکے۔ یہ بھی یقینی امر ہے کہ کسی قوم کا تنزل اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جب وہ اپنے آئیڈیل سے کج روی اپنی عملی اور روز مرّہ زندگی شروع کر دیتی ہے۔ خواہ بہ ظاہر وہ بڑی دیندار نظر آرہی ہو یا ترقی پذیر، یا مفکر، مخلص اور محنتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسا اصول اور پیمانہ ہے جس کے ذریعہ ہم کسی نصب العین کی پائداری اور اس کی زندہ رہنے والی اقدار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ مستحکم ہے کہ ذہن اور یقین کی میزان اور یک رخی ہی عملی زندگی میں انہماک کار اور ثبات کی ضامن ہوسکتی ہے۔ نصب العین کی دائمیت، انسانی زندگی سے اس کی ہم آہنگی، فطرتِ انسانی سے اس کی مطابقت خود اس بات کی ضامن ہیں کہ افراد اور جمعیت اس کی افادیت کو مان لے۔ اپنی فلاح معاشرے کی فلاح اور آئندہ آنے والی نسلوں کی فلاح اسی نصب العین پر قائم ہو کر حاصل کرے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی نکتہ دانی کی ہے کہ قوم کے احیاء کے

لئے ارتقاء کی لازمی ضرورت ہے۔ چونکہ ہر پائیدار نصب العین کی جڑیں چشمۂ حیاتِ انسانی کے سوتوں میں ہوتی ہے، اسی لئے اس کی دائمی قدر و قیمت ہے۔ افراد آتے ہیں اور فنا ہوتے ہیں۔ قومیں آتی ہیں اور پھیلتی ہیں یا فنا ہوتی ہیں، مگر حیاتِ انسانی جاری رہتی ہے۔ سنت اللہ اور فطرۃ اللہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ فطرت کے مطابق زندگی کو حیات بھی ہے اور ارتقاء بھی۔ اسی لئے مشاہدہ اور سائنسی طریقے سے دیکھتے ہوئے بہت سے ایماندار مغربی فلسفیوں اور مفکرین نے یہی کہا ہے کہ اسلام ہی پائیدار رہنے والا نظریہ ہے۔ کیونکہ یہ عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ فطرتِ انسانی میں بقا کا بھی پہلو ہے اور ارتقاء کا بھی، فطرتِ انسانی میں لوچ بھی ہے، لچک بھی۔ ماحول کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت بھی ہے اور یہی کچھ اسلام کا آئیڈیل ہے۔ انسانی فطرت سے مطابقت بھی ہے اور انسانی فلاح کے لئے لوچ اور لچک بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے بلند سے بلند تر نظریات ہوتے ہوئے ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے قابلِ عمل رہے۔

اسلام کے نظریات میں یہ لچک ہے کہ انسانی ارتقاء اور ترقی کے ساتھ ساتھ یہ اسی طرح لبدلآ باد تک قائم رہیں گے۔ اسلام کی وسعت اور لچک تو دیکھیں کہ اس کے آئیڈیل میں اتنی وسعت ہے کہ انسان کے اندر حیوان کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور فرشتے کو بھی جو انسان میں ہے۔ گویا مقام ناسوت پر بھی اسلام راہنمائی کرتا ہے اور مقام ملکوت پر بھی۔ بلکہ اس کے آگے انسان کو اس کے اعلیٰ مقامات جبروت، لاہوت تک پہنچانے کے لئے بھی مشعل راہ ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ''اَصْلُهَا ثَابِتٌ فِی الْاَرْضِ'' کہہ کر ایک طرف جسمانی مادی سطح پر زندگیاں گذارنے، گویا زمین پر چلنے کو کہتا ہے۔ تو

دوسری طرف ''فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ'' کہہ کر آسمانوں میں پرواز یعنی مقاماتِ قلب، روح، سر، خفی، اخفاء کی جانب گامزن کراتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہی درخت پائیدار ہے جس کی جڑیں زمین میں ہوں اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوں۔ گویا باطن میں بھی رسائی ہو اور ظاہر میں بھی نشرِ فیض۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے جڑ اور زمین مضبوط ہوتی ہے پھر کہیں شاخیں پھلتی پھولتی ہیں۔ اسی لئے فرد اور جماعت کی مذہبی زندگی کہو یا دنیوی زندگی، ابتداء اس کے اسلام کی شروع ہوتی ہے خلافتِ ارضی سے، مقامِ ناسوت سے، مادی زندگی کے حسن سے۔ آج جن قوموں نے بھی اسلام کا یہ بنیادی نظریہ جمعیت انسانی کی مادی فلاح کا، اپنا لیا ہے، وہ درحقیقت اسلام پر ہی کاربند ہیں خواہ اپنے کو کچھ کہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں نے اسلام کو ظاہری ارکانِ دین کا پابند کرکے اپنی روز مرّہ زندگی میں اسلام کی خلافتِ ارضی اور مادی زندگی کے حسن سے نہ کوئی ذوق شوق پیدا کیا، نہ اس کے اصولوں کو اس مادی سطح پر قابلِ عمل سمجھا۔ ان کا دین الگ، دنیا الگ۔ ان دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر وہ زندگی گذارتے ہیں۔ پھر کیسی بقاء، کیسا ارتقاء، کیسا نصب العین، کیسا منزل کا تعین، کیسا زندگی کا مقصد۔ اسلام کو ہر شعبہ میں اصولِ زندگی بنانا ہے۔

اسلام، ہر شعبہ زندگی میں رہنما

جب یہی بات مقرر نہ ہوسکی ہم کیوں زندہ ہیں، کیا کرنا ہے، کیا مقصد ہے تو پھر کیسی دنیا، کیسی عاقبت۔ ایک خودفریبی میں بے تعین زندگی گذارنے سے قوم کو کیا حاصل۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اسلام، صحیح طور سے نہ صرف سمجھنا ہوگا بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اسے مدد ومعاون، رہنما، ہم سفر، مصلح

و خیر خواہ، اور اصولِ زندگی بنانا ہوگا۔ اسلام کے ہر پہلو کو اس کی فطری ہم آہنگی اور محرک قوتِ عمل میں بروئے کار لانا ہوگا تا کہ فطرتِ انسانی کی نشو ونما، فروغ اور ارتقاء ہو۔ اگر مسلمان ہوتے ہوئے ہم ایسا نہ کر سکے تو یہ اپنی کم فہمی ہوگی، نہ کہ اسلام کے اصولوں کی کوتاہی۔ جاننا ہے کہ دین نہ آئین ہے۔ نہ اصول میں۔ نہ کتاب میں۔ دین تو عمل پیرائی میں ہے کاروبارِ زندگی میں مستحسن نظریہ اپنا لینے کی بات ہے اور وہ بھی اپنی ذاتی فلاح کے لیے نہیں بلکہ جمعی فلاح کے لیے۔ گویا دین تو ایک اندازِ فکر و عمل میں ہے۔ نہ کہ صرف نظریاتی اصولوں کو جان لینے میں۔ اصول تو انسان کی حرمت و فلاح کے لئے ہیں۔ اور انسان چونکہ خود شاہکارِ خداوندی ہے تو اس سے افضل اور اس سے محبوب ترین شے اور کونسی ہوسکتی ہے۔ جب اپنا ہی نمونہ بنا کر بھیجا تو اس سے زیادہ پیارا کون ہوتا ہے۔ انسان سے اس پیار اور محبت کی شدّتِ خداوندی کو اپنا کر اگر مصلحین، مفکرین، معلمین، حاکمین ہی کیا، پورے کا پورا معاشرہ ایک ہی تو حیدِ فکر میں ہو جائے تو قوم کو خود اعتمادی بھی آجائے اور راہیں بھی کھلنے لگیں۔

اگر اپنے ہر فکر، ہر عمل، ہر تخیل کے پیچھے یہی دھن اور لو لگ جائے کہ ہم شاہکار خداوندی ہیں، مطلوب و مقصود ہیں، اشرف ہیں تو پھر نہ کج روی آپائے گی، نہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ہوگا۔ اور نہ قسمت و تقدیر کی شکایت رہے گی۔ اس حقیقت کو پا جانے کے بعد، اس کیفیت میں آجانے کے بعد، مرضی الٰہی کے ساتھ راضی بہ رضا رہنا یہ نہ ہوگا کہ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ کچھ نہ کرو، ناکارہ ہو کر رہ جاؤ، دنیا سے دست بردار ہو جاؤ، بلکہ قدرت کی امانت کرنا ہوگی۔ خود دستِ قدرت بنکر، فطری جوشِ عمل میں زندگی کو زندہ مردوں کی طرح گذارنا ہوگا۔ پھر معلوم ہوگا کہ ایک مسلسل کوششِ پیہم، ایک جمعی جدوجہد

اور قومی زندگی کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینا مقصدِ زندگی ہے۔ اور یہی انسان کے قلبی سکون کا ذریعہ بھی ہے اور حق تک رسائی کا ذریعہ بھی۔ مردانیت کا زیور، تن دہی، انہماکِ کار، مسلسل کوشش کے ساتھ نہ صرف ہر چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ اس میں ایک خوشی سی حاصل کرنا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عزم و پیکارِ زندگی میں کون سے عمل مرضی الٰہی کے تحت ہیں اور کونسے صرف اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے۔ صاف ظاہر ہوگا کہ خودغرضی، حرص و ہوا، خود پرستی، جاہ طلبی، زر اندوزی وغیرہ سارے کے سارے شیطانی اور مشرکانہ عمل ہیں، اور ان کی کوئی پائدار اقدار بھی نہیں۔ اپنی زندگی کے ساتھ یہ سب بھی ختم ہوجاتے ہیں اور حسرت طلب ہی انکا انجام ہے۔ البتہ ساری اعلیٰ اقدار جیسے بے لوث خدمت، ایثار، خلوص، محبت، صداقت، دیانت، امانت، سخاوت وغیرہ عین رحمتِ الٰہی کا ذریعہ ہیں اور مرنے کے بعد بھی آئندہ نسلیں ان سے مستفید ہوتی رہتی ہیں۔

کتنی خوش نصیبی ہے کہ اَمرِ ربّی کے اظہار اور نفس، قلب، روح تمام سطحوں پر اس مرِ ربی کی عمل پیرائی کا ذریعہ یہی وجود انسانی ہوگا۔ اور اسی عمل پیرائی میں انسان کے اپنے باطن کا ارتقاء ہوگا۔ نفس، لطیفہ نفس، روح کی منازل طے کرتا ہوا یہی انسان اپنے عروج کی طرف قدم رکھے گا۔ رابطہ خلق ہی رابطہ الٰہی کا ذریعہ ہوگا۔ خدمت خلق کی خاطر جو عمل ہوگا وہ اپنی ذات کے لئے نہ ہوگا۔ بے ریا، ہوگا۔ عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوگا، کہ خالق کو اپنی خلقت سے ایسی ہی محبت ہے۔ اگر یہی تخیل یہی نظریہ ہر فرد میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمل پیرا رہے گا تو وہ ایک بار آور درخت کی تمثیل بن جائے گا۔ جس کی جڑیں زمین میں ہیں، اپنے مادی وجود میں ہیں اور شاخیں آسمانوں میں ہیں،

زندگی کی اعلیٰ اقدار میں ہیں اور اس کے پھل سے کائناتِ عالم مستفید ہوتی ہے۔ کلمہ طیبہ کی یہی شان حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ یہ روزمرّہ زندگی میں کلمہ طیبہ کی عمل پیرائی ہے۔ خدمت خلق ہی میں عملِ صالح ہے۔ اسی بے لوث عمل سے حیات طیّب ہو جاتی ہے۔

فلاحِ عام بن کر ہی انسان "حَیّ وَ قَیُّوم" تک رسائی کرتا ہے۔ خدائی صفات کی عمل پیرائی کرتے ہوئے، ان صفات سے متصف ہو کر جو اس کی فطرت میں ودیعت ہیں ایک انسان عارف باللہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اپنی فطری صلاحیتوں کے گنج گرانمایہ کو اپنے عملی کردار سے اظہار میں نہ لا سکا تو وہی حیوان کا حیوان۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مفلس۔ یوں اپنی انفرادی زندگی سدھارنے کی تگ و دو میں لگا رہا اور ناکام رہا تب بھی اس میں معاشرہ کا قصور ہی دیکھا جائے گا۔ فرد کا قیام، رابطِ ملت میں ہی ہے۔ اسلامی نظام رابطِ ملت میں ہے۔ معاشرہ ہی، فرد کی فلاح کا ذمہ دار ہے۔ یہی تو احسان ہے اسلام کا انسانیت پر۔ اس سے قطع نظر اگر انسان نے اپنی ذاتی جدوجہد سے صرف اپنے مفاد کی خاطر اپنی دنیوی زندگی سنبھال لی، یا اپنی دینی فلاح کے لئے پاکی، طہارت، عبادت، ذکر اذکار میں زندگی گذاری تب بھی تو صرف یہ اپنی 'مَیں' کی خاطر ہوا۔ یہ عملِ صالح کب کہلا سکتا ہے۔ اس فریب سے تو اپنے کو نکالنا ہے۔ شیطان نے بھی تو اپنی 'مَیں' کے پیچھے موحد ہونے کا دم بھرا تھا۔ اس فریب سے عبدیت کی ایک جست ہی انسان کو نکال سکتی ہے۔ مرضیٔ الٰہی، حُبِّ الٰہی اور مخلوق کی محبت میں اس اپنی 'مَیں' کی گنجائش کہاں۔ اس نظریئے سے دیکھا جائے تو انسان اپنی دنیا اور عقبیٰ کی فکر میں سوائے خودغرضی کے اور کیا کرتا ہے۔ اللہ کو تو نہ ہماری نمازوں کی ضرورت ہے، نہ ریاضتوں کی۔ یہ تو ہر حال

میں ہم اپنے لئے ہی، اپنی عبودیت کے اظہار میں کرتے ہیں۔ البتہ خالصتاً للہ تو وہ ہی اعمال ہونگے جو خدا کی مخلوق کے ساتھ نیک دلی سے کئے جائیں۔ بھوکے کو کھانا، ننگے کو کپڑا، بیمار کو دوا دارو، جاہل کو علم، دردمند کو ایک میٹھا لفظ ہی انسانیت کے کام کی چیز ہے۔ یوں انسان تمہارا دیا کھانا کھا کھا کر کہاں تک اپنی ارتقاء کرسکتا ہے یا اپنے نفس کی اصلاح کرکے لطیفہ نفس اور قلب کی منازل وغیرہ تک قدم بڑھا سکتا ہے۔ البتہ محبت خلوص اور اس کی رفاقت اور ہم سفری کرکے تم اس کی تکالیف بھی گھٹا سکتے ہو، اس کے وہم و گمان کو بھی یقین اور ایمان میں بدل سکتے ہو۔ اسے خود اعتمادی دلا کر اور اسے خود عمل پیرا کرا کر اسکی مردہ صلاحیتوں کو بیدار کر سکتے ہو۔ اس طرح مادی اور نفس کی سطح پر اسے ہاتھ پیر اور جسمانی کوششوں میں لگا سکتے ہو۔ مگر جب تک یہ انفرادی سطح تک رہینگی تم اسے نفس پرست بناتے جاؤ گے اور جیسے ہی اجتماعی رنگ دیا تو اسے نفس کے جال سے نکال کر لطیفہ نفس کے مقام پر لے آؤ گے۔ اور اعلیٰ اقدارِ حیات یعنی جمعی زندگی کی برکتوں سے روشناس کرا سکو گے۔ اس کے بعد قلب کی سطح جو تہذیب یافتہ نفس سے اوپر کی سطح ہے تم اس کے لئے محبت کے انداز میں کشادہ کر سکو گے۔ محبت کا فطری جذبہ ہر انسان میں موجود ہے۔ جس کے تحت سب کچھ محبوبؐ کے نام پر، سب کچھ محبوبؐ کی اُمت کی خاطر قربان کرنا آجائے گا۔ محبت کرنے والے کی زندگی تو ہر سطح ہر عمل میں محبوبؐ کی رضا جوئی میں گذرتی ہے۔

مسلمان کا منتہائے نظر، خدا اور رسولؐ کی خوشنودی

مسلمانوں کا منتہائے نظر، خوشنودی خدا و رسولؐ ہے۔ یہ آئینِ حیات

کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں۔ مسلمان کا نصب العین فروغ اسلام ہے۔ رحمت بن کر چھا جانا ہے۔ اس کا اصول حقیقت بینی ہے۔ علم و عرفان سے اپنے کو مزین کرلینا ہے۔ کار زندگی میں اس کا پہلا قدم، عملی جمعیت بندی ہے۔ اسی کے لئے مسلسل عملِ پیہم ہے۔ مسلمان کے لئے اسلام کے اس سبق میں دنیا اور دین دونوں کی فلاح کی ضمانت ہے۔ اس بات پر بھروسہ اسے ایمان کی حد تک ہے۔ اور یہی ایمان اس کے لئے بذات خود ایک مہمیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی ایمان کی محرک قوت، اس کی باطنی فطری صلاحیتوں کو بیدار کرکے ایک والہانہ جوشِ عمل، ایک بے ساختگی عطا کرتی ہے جس میں ہر مسلمان خدا اور رسولؐ کی خاطر اپنی زندگی کو اُمت کی خاطر وقت اور قربان کردینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا وہ کُن جو اسلام کے اوّلین چالیس سالہ دور میں اس قوم کو عطا ہوا تھا۔ اسی لئے دنیا اور عاقبت کی فلاح کے اس سادہ نسخہ پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے کے علاوہ قوم کی نظر میں کوئی دوسری بات جم ہی نہیں سکتی تھی۔ نہ دنیا کے عیش و آرام، نہ مال و متاع، نہ ہوسِ اقتدار نہ انسانی یا غیبی امداد کی فکر میں بے دست و پائی اس کی راہ کھوٹی کرسکتے تھے۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا نظریہ حیات اس کی نظر میں جم سکتا تھا۔ خدا اور رسولؐ کی ذات میں یہ بھروسہ ہر مومن کی زندگی کا چراغ اور اس کے ہر عملِ کردار کا ضامن بن گیا تھا۔ اسی خود اعتمادی میں پھر مسلمان قوم نے ایک جسم ایک جان بن کر اپنی ارتقائی منازل طے کیں۔ اور آداب، اخلاق، تعلیم، معاشرتی اصول، اقتصادی اصول، ملک گیری، نظامِ سلطنت ہی کیا، ہر شعبہ زندگی میں اسلامی تعلیم کو سربلند کرکے، اور رحمت عالم بن کر دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ مسلمان کے لئے اسلام آئینِ زندگی، اصول زندگی، پیامِ حیات لے کر آیا تھا۔ اس جمعی معاشرتی

فلاح کے پھل وہ ہر شعبہ زندگی، ہر جدوجہد، ہر کوشش میں پا رہا تھا۔ اسی لئے جسمانی ، ذہنی، اخلاقی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر وہ اپنی زندگی کا نذرانہ محبوبؐ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا۔

اس کے اس جمعی فلاحی نظریئے میں اتنا خلوص اور صداقت تھی کہ بعد میں دوسری قوموں نے اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے کو زمانے میں سربلند کر لیا اور اَنعَمتَ عَلَیہِم کے مصداق ہوگئے۔ مگر مسلمان نے اپنا یہ حال کر لیا کہ گم گشتہ راہ ہوگئے۔ آج مسلمان کے پاس جسم بھی ہے، ذہن بھی ہے، انسانوں کی کثرت بھی ہے، فطرت کے عطا کردہ خزانے بھی ہیں، اسلام کا پیغام بھی ہے، ارکانِ دین کی پابندی بھی ہے، مگر دنیا میں خستہ حال ہیں۔ نہ وہ فقرِ بوذرؓ ہے، نہ وہ سطوتِ عمرؓ، نہ صدقِ ابوبکرؓ، نہ جلالتِ حیدرؓ۔ بات یہ ہے کہ اپنے پر اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ نظریں دوسروں کی امداد کی طالب ہیں۔ غیرتِ دین بھی گئی اور اخوّت و جمعیت بندی بھی۔ اسلام کا پہلا سبق اس اخوّت اور جمعیت بندی کے علاوہ اور کیا ہے۔ کلمہ بھی پڑھا تو اسی لئے، کہ ایک مضبوط رسی میں بندھ جائیں یہ جمعی فلاح کی خاطر، مصروفِ عمل رہنا ہی تو دین، ایمان اور عبادت ہے۔

اب وقت آیا ہے کہ پھر سے احیائے اسلام ہونا ہے۔ جمعی فلاح کے لئے تمام عالمِ اسلام کو ایک جسم ایک جان بن جانا ہے۔ اپنی جسمانی ذہنی، فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ اُمت کے غم میں آنسو بھی بہانا ہیں۔ خون پسینہ بھی صرف کرنا ہے۔ اُمت کی حرمت کی خاطر جانیں بھی قربان کر دینا ہیں۔ اسلام کا یہی نصب العین ہے۔ یوں ہر فرد یا قوم کا اپنی اپنی منفرد زندگیاں گذارنا، تو صرف حیوانی سطح تک کی بات ہے۔ یہ بھوک، کپڑا، مکان، حرص، ہوس، لوٹ کھسوٹ، حسد، بغض، افراتفری اسلام کا نصب العین کب ہے۔

مسلمان قوم نہ تو نسل کی پابند ہے، نہ ملک کی۔اس کی مثال تو ایک درخت کی سی ہے یا ایک جسم کی سی۔ اسی میں کالے ہیں، گورے ہیں، دولت والے ہیں، نادار ہیں، مگر ہیں تو سب کے سب ایک اُمت۔ اس قومی توحید، اس اُمتِ واحدہ کے جسم کے ٹکڑوں کو ایک جگہ جمع کر دینے سے ہی بات بننے لگے گی۔کسی کی جسمانی خدمت، کسی کی ذہنی خدمت، کسی کی مالی خدمت، کسی کی اخلاقی خدمت۔ الغرض ملتِ اسلامیہ کے ظاہر باطن کو ایک میزان میں لانا ہے۔ ملت کا جسم، ذہن، جان، وجود ایک ہی توحید میں ہوجائے۔نفس، قلب، روح ساری کی ساری ملتِ اسلامیہ یک رخی اختیار کر لے تو نئے نقشے ظہور میں آنے لگیں گے۔ ملت کی اس جمعی قوت کا مقابلہ پھر کونسی قومیں کرسکیں گی۔

آج پھر سے مسلمان کو اپنے انفرادی ، روزگار، پیشہ تک میں اسی جمعی فلاحی پہلو کو اجاگر کرنا ہے۔ تجارت کرنے والا ہو تب بھی بازار میں قوم کی خدمت کے لئے بیٹھا ہو۔کھیتی کرنے والا بھی قومی خدمت کا جذبہ لئے ہو۔ دست کار بھی، مزدور بھی، معلم بھی، ڈاکٹر بھی، الغرض ساری قوم کے افراد اپنی انفرادیت سے نکل کر قوم کے لئے ہی جی رہے ہوں۔

کتابی علم یا نظریاتی علم، خواہ دین کا ہو، خواہ دنیا کا، بالکل بے کار ہے جب تک اسے عملی سانچہ میں نہ ڈھالا جائے، زراعت وصنعت، حرفت، تجارت، ملازمت، روز مرّہ کے پیشے، نجی کاروبار، عبادت، ریاضت ، سب میں عملی اقدامات کے ارتقائی پہلو گامزن ہوں، جس میں جمعیت ایک اسلامی دینی جذبہ میں فلاح پا رہی ہو۔ قومی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی نظام کی ترقی کا پروگرام ہو۔نصب العین فوری اور دور رس ایسے مقرر کئے گئے ہوں جو انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہوں تا کہ موجودہ اور آئندہ نسلیں ایک امید، یقین، ولولہ اور جوش

میں آگے بڑھتے رہیں۔

اس ترقی کے لئے ہر شعبہ زندگی میں ماہرین فن کی ضرورت ہے۔ جو خود اپنے ہاتھوں سے کام کریں۔ اپنے عملی کردار سے اس مادی دنیا کا بوجھ بھی عظیم المرتبت انسانوں کی طرح اٹھائیں۔ سائنس کا میدان ہو یا عمرانیات و اقتصادیات کا، غرض ہر شعبہ علم میں زندگی کا عملی مقصد ایک مذہبی تقدس لئے ہو۔ اور سچائی ، اخوت، قومی فلاح پر مبنی ہو۔ خوشنودی خدا و رسولؐ حاصل کرنے کے لئے ملتِ اسلامیہ اور عالم انسانی کی فلاح کا مطمح نظر ہر شعبہ زندگی میں نظر آئے۔ اسلام کے پیام میں یہ حوصلہ مندانہ عالمی اخوۃ کا جذبہ موجود ہے۔ اسے عملی شکل میں بروئے کار لاکر اس جہان میں سرخروئی حاصل کرنا ہر فرد کے لئے باعثِ فخر ہوسکتا ہے۔ صرف اسی یقین اور جذبہ کے تحت، ایک فطری دلچسپی میں انہماکِ کار، ہر فرد کو نصیب ہوسکتا ہے۔ خدا اور رسولؐ پر بھروسہ اور ایمان ہی زندگیوں کی محرک قوتِ عمل بن سکتا ہے۔ اور یہ جذبہ عمل پھیلایا جاسکتا ہے۔

فروغِ اسلام کے لئے جن قوموں کو منتخب ہونا ہے ان میں قومی اُمتیاز، دماغی رعنائی اور اسلامی توازن موجود ہونا ہے۔ ایمان اور ذہن کی میزان میں روز مرّہ زندگی گذارنا بقائے قومی کی ضمانت ہوا کرتی ہے۔ اسلام کے بلند نظریاتی اصول، ماحول کے مطابق لوچ اور لچک خدا رسولؐ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے زندگیاں گذارنا، بذاتِ خود انسانیت کی فلاح کے لئے عمل پیرا ہوجانے کے لئے تازیانہ کا کام دیتے ہیں ۔ اسلام کے اصول کے تحت، فرد کے تخیل سے ہٹ کر قومی فلاح کے لئے زندگی وقف کردینا، عقبیٰ میں سُرخروئی اور قومی حیات کی ضمانت ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی کلّیۃً قلب و روح کے ساتھ مالک کے سپرد ہوجانا ہے۔ راہِ حق میں اپنی زندگی کی قربانی اس طرح

پیش کرنی ہے کہ دنیا کی محبت، دولت، اقتدار، اولاد، تعلقات، ہر چیز کو راہِ حق میں قربان کر دینا اس کے تقویٰ کا ثبوت ہو۔ اس قربانی سے ہی دل کو حقیقی سکون، سُرور و کیف اور عید کی خوشی میسر ہو سکتی ہے۔

حدیثِ مبارک ہے ''حبِّ دنیا اور کراہیّتِ موت یہ تم میں آجائیں گی۔ اگر چہ مسلمان اب سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ مگر دوسرے حاوی ہو جائیں گے۔'' موجودہ مسلمانوں کی بنیادی بے راہ روی جو کچھ بھی ہے اس کے پسِ پشت یہی حُبِّ دنیا اور کراہیّتِ موت ہے جس وقت بھی عقبیٰ اور دائمی زندگی پر نظر جم گئی فرد اور قوم کی فلاح لازمی ہے۔

امورِ سلطنت میں اسلام کا سبق تمام نظریات سے بلند ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کُھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اسلام کے سبق کے مطابق حُرمتِ انسانیت، حُرمتِ خون، حُرمتِ آبرو، بھی حُرمتِ کعبہ کی طرح ہے۔ خود خلیفہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اعمال پر نکتہ چینی کے لئے عوام کو دعوت دینا اس لئے ضروری ہے کہ حاکم، مخلوق کا خادم ہے۔ حاکم کو بے غرض ایماندار اور قابل اعتماد ہونا ہے۔ اس کا دائرہ عمل، حسنِ انتظام، تدبر، ترقی پسندی پر مبنی ہوتا ہے۔ اسے اپنے ذاتی اعلیٰ کردار کی ضمانت کا عہد دینا ہے۔ عدل و انصاف پر سختی سے کاربند رہنا ہے۔ اسے یہ بھی حلف لینا ہے کہ ''ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا، باریک کپڑے نہ پہننا، چھنا آٹا نہ کھانا، دروازہ پر دربان نہ بٹھانا، دروازہ کو اہلِ حاجت کے لئے کھلا رکھنا، اپنے مال و اسباب کی فہرست پیش کرنا۔'' اسی سادگی میں اسلامی نظریہ کے تحت مسلمانوں کو مساوات، برابری، انصاف کا عملی ثبوت پیش کرنا ہے۔ اور رحمت بنکر زمانہ پر چھا

جانا ہے، تاکہ اسلامی مملکت عالمِ انسانیت کے لئے امن، عافیت اور ترقی کی ضمانت بن جائے۔ اور کچھ اس طرح کہ سب عالمِ انسانیت ایک ہی جسم، ایک ہی جان، ایک ہی روح بن کر اس عالم میں زندگی گذار رہے ہوں۔ اور نظامِ کائنات کی طرح ایک ہی توازن میں ہوں۔ اور جیسے ایک ہی سورج کے گرد مختلف سیارے اپنے اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے بھی اسی نظامِ شمسی کی میزان بنتے ہیں، اسی طرح ساری ملتِ انسانی ایک ہی ایکائی میں مصروفِ طواف ہو۔ اس کا قیام، رکوع سجدہ، ایک ہی یکتائیتِ توحید میں ہو۔ شمسِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس باطنی کشش کے اثر میں آکر پھر کہیں اس بے ترتیب ستاروں کے قافلے کو اپنی اپنی راہ ملے گی۔ اپنے اپنے مدار اور محور پر گردش کرتے ہوئے بھی وہ اسی نظامِ شمسیٔ رحمتِ محمدیؐ کی آغوش میں آجائیں گے اور ان کے اس عشقِ مرکز، رقصِ پیہم سے، ''اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن'' (ہم اس کی جانب رجوع ہیں) کی صدائے ارغنوں اٹھے گی جس کی بازگشت عالمِ انسانی کے ہر قلب میں ہو کر رہے گی۔

❁❁❁❁